[illegible] 7243 Phone [illegible]

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1973

طلوعِ اسلام کنونشن

۲۲- لغایت ۲۵ر نومبر ۱۹۷۳ء

بمقام ——— ۲۵/بی گلبرگ لاہور

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی ربوبیت پسیامبر نظام کا

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

طلوعِ اسلام

بدل اشتراک

سالانہ پاکستان دس روپے

سالانہ غیر ممالک ایک پونڈ

ٹیلیفون

٨٠٨٠٠

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

جلد (۲۶)

نومبر ۱۹۷۳ء

نمبر (۱۱)

فہرست

(۱) لمعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲

(۲) عیدِ آزاداں ۔ عیدِ محکوماں ۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔ ۱۱

(۳) طلوعِ اسلام کا لج فنڈ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵

(۴) پیامِ عید ۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔ ۱۷

(۵) سوراجِ اسلام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۱

ایڈیٹر۔ محمد خلیل، ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لمعات

ہمارے ہاں پچھلے دنوں جو سیلاب آئے، ابھی ان کا پانی بھی خشک نہ ہونے پایا تھا کہ ایک اور طوفان امڈ آیا۔ اس اعتبار سے یہ دونوں سیلاب مشترک تھے کہ ان کا سرچشمہ بھارت کی سرزمین تھی، لیکن اس نہج سے یہ ایک دوسرے سے مختلف تھے کہ پہلا سیلاب ہماری سنگ و خشت کی بستیوں کی تباہی کا موجب بنا تھا، اور اس دوسرے سیلاب کا مقصد ہمارے فکر و نظر کے کاشانوں کو بہالے جانا ہے۔ وہ سیلاب دریاؤں میں بے محابا پانی امڈ آنے کا نتیجہ تھا اور یہ سیلاب بھارتی پراپیگنڈہ کی اس مشینری کا پیدا کردہ جس کا منبع امرتسر کا ٹیلی ویژن اسٹیشن تھا جس کے "بند" اس مہینے کے شروع میں کھولے گئے۔ لیکن، ان دونوں سیلابوں میں اس سے بھی زیادہ عمیق اور مہیب فرق یہ تھا کہ اس سیلاب سے محفوظ رہنے کیلئے لوگ جانیں بچا کر بھاگ اٹھتے تھے لیکن اس کی طرف وہ خود کشاں کشاں جاتے تھے۔ چنانچہ جس رات اعلان ہوا کہ وہاں سے ایک بھارتی فلم دکھائی جائیگی، سنا ہے کہ لاہور کے سینما ہال تک خالی ہو گئے اور سڑکوں پر تماشائیوں کے ہجوم سے ٹریفک بند ہو گئی۔ چنانچہ اب بھارت کے شکر پارہ فروش، اپنے لطیف و خبیث پراپیگنڈہ کی تلخ، زہریلی گولیاں، ٹیلی ویژن پروگرام کی جاذبیتوں میں لپیٹ کر پھینکتے، اور اہل پاکستان انہیں بے محابا نگلتے چلے جا رہے ہیں۔

اس سیلاب کے شور کو سنکر ہمارے ذمہ دار ارباب قوم اسطرح بلبلا کر اٹھے جیسے اس حادثہ نے انہیں بغتۃً (اچانک) آن دبوچا ہے، حالانکہ امرتسر میں ٹیلی ویژن کی تنصیب کی خبریں پچھلے سال سے فضا میں پھیل رہی تھیں، اور گذشتہ جنوری میں انہوں نے تجربتہً اس کا ایک آدھ پروگرام نشر بھی کیا تھا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں تھی کہ بھارت، اپنے بڑے بڑے مشہور شہروں کو چھوڑ کر اس تنصیب کے لئے جو امرتسر کو منتخب کر رہا ہے تو اس سے اس کا مقصد کیا ہے۔ اس تمام دوران میں "ہمارے اصحاب کہف" نے کچھ نہ سوچا کہ اس آنے والے خطرہ کا سد باب کیسے کیا جائے۔ جب سیلاب کا پانی، واہگہ سرحد سے اسی میل اندر گھروں کی خلوت گاہوں تک آ پہنچا تو یہ خواب سے بیدار ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے "دوڑیو، پکڑیو" کا شور مچانے لگے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سیلاب کی تباہیوں سے بچنے کے لئے انہوں نے علاج کیا سوچا؟ انہوں نے قرارداد پاس کر کے، بھارت کے ارباب حل و عقد کی سیوا میں بھیجی (خدمت میں التماس) کی کہ اس قسم کا شور ہماری نیند میں خلل ڈالتا ہے اس لئے آپ حق ہمسائیگی کا خیال رکھتے ہوئے اس سے احتراز برتئے۔ ہم اس کے لئے آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ اُدھر تو یہ کیا اور اِدھر قوم سے للکار کر کہا کہ تم بڑے بے حمیت اور بے غیرت ہو جو دشمن کے پراپیگنڈہ

کیطرف یوں لپک کر جاتے ہو۔ شرم اور حیا سے کام لو۔ اور اپنے ٹیلی ویژن سیٹوں کا رُخ اُدھر نہ موڑو۔ یہ کہا اور پھر کروٹ بدل کر سو گئے۔ پہلے سیلاب کی طرح اس دوسرے سیلاب کا مسئلہ بھی یوں حل ہو گیا!

جب قومیں عقل و شعور کی راہیں بند کر کے، جذبات سے کھیلنے لگ جاتی ہیں تو ان کی کیفیت یہی ہوا کرتی ہے۔ کوئی مسئلہ (PROBLEM) پیدا ہو، کوئی حادثہ رونما ہو، بجائے اس کے کہ وہ عقل و فکر سے کام لیکر اس کے اسباب و علل کی تحقیق کریں۔ وہ سوچیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے اور اس کے بعد فہم و تدبر کی رُو سے اس سے نمٹنے کی تدبیر کریں، ان کا ردِ عمل بھی جذباتی ہوتا ہے اور اس کا حل بھی جذباتی۔ قوم جذبات سے مشتعل ہو جاتی ہے اور اسبابِ حل و تشفی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ خطرہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ جن قوموں کا شعور بیدار ہو ان کی کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ اوّل تو وہ آنے والے خطرات کی نمود سے بہت پہلے ان کا اندازہ لگا لیتی اور قبل از وقت ان کی حفاظتی تدابیر کی فکر کر لیتی ہیں۔ اور اگر کبھی کوئی حادثہ ہنگامی طور پر رونما ہو جائے تو بھی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھتی اور سوچ بچار سے کام لیکر اس کا سدِّباب تلاش کرتی ہیں۔ امرتسر ٹیلی ویژن کے اس "حادثہ" پر ہمارے لئے سوچنے کی بات یہ تھی کہ (۱) ہمارے عوام اس کی طرف لپک کر کیوں گئے ہیں اور (۲) ہمارے "دانشوروں" نے اس کا استقبال خندہ پیشانی سے کیوں کیا ہے، یا کم از کم یہ کہ اس سے احتراز کیوں نہیں برتا؟ یہ معلوم کر لینے کے بعد، اس خطرہ سے حفاظت کی بات کی جا سکتی تھی۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے، اگر ان کے ذہن کی مناسب تربیت نہ کی جائے تو ان کی کیفیت بالکل بچوں کی سی ہوتی ہے۔ جو ہر کشش کیطرف لپک کر جاتے ہیں۔ اس میں نہ نفع نقصان کا خیال ان کے سامنے ہوتا ہے نہ کسی خطرہ کا احساس دامنگیر۔ مثالیں اس کی ہر روز ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک بچہ جب کٹے ہوئے پتنگ کیطرف لپکتا ہے تو اسے اس کا قطعاً خیال نہیں رہتا کہ وہ چھت پر سے گر جائے گا۔ چنانچہ اس قسم کے حادثات اور بعض اوقات اموات کے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بچے اس سے باز نہیں آتے۔ یہی صورت آتش بازی سے جل جانے کی ہوتی ہے۔ یا مثلاً بچے کھانے کے میز پر بھی کیوں نہ بیٹھے ہوں، بندر یا ریچھ کا تماشا دکھانے والے کی ڈگڈگی کی آواز کان میں پڑی، اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اٹھ بھاگے۔ انہیں ہزار آوازیں دیتے رہیے، وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے تک نہیں — آپ اس کا علاج کیا کرتے ہیں؟ بچوں کو وعظ، نصیحت نہیں کرتے۔ وعظ نصیحت ایسے معاملات میں کارگر ہی نہیں ہو سکتے۔ آپ، اس کھیل تماشے سے زیادہ جاذب چیزیں گھر میں مہیا کر دیتے ہیں۔ پھر بچے اُدھر نہیں لپکتے۔ جب بچے ٹیلی ویژن پر بچوں یا جانوروں کے پروگرام میں جذب ہوں، بندر والے کی ڈگڈگی ان پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ (یا مثلاً) اس سے پہلے جب ہمارے اسکولوں کے پروگرام پڑھنے پڑھانے تک محدود ہوتے تھے، تو بچے اسکول کے نام تک سے گھبراتے تھے، اور اکثر و بیشتر بھاگ جاتے تھے، تعلیم کے فوائد کی ہزار نصیحتیں بھی ان پر کچھ اثر نہیں کرتی تھیں۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ اسکولوں میں "گھر سے بھی زیادہ" جاذب تماشوں کا سامان مہیا کر دیا گیا۔ اب وہ بچے، اسکول کے وقت سے گھنٹہ گھنٹہ بھر پہلے، دس دس سیر کا بستہ اٹھائے، سڑک پر کھڑے بس کا انتظار کرتے نظر آتے ہیں، اور انہیں چھٹی کا دن گھر پر گذارنا دو بھر ہو جاتا ہے۔ بچوں میں یہ تبدیلی کس طرح واقع ہو گئی؟ انہیں زیادہ دلچسپ اور پُرکشش سامان مہیا کرنے سے۔ یہی حالت ان عوام کی ہوتی ہے جن کے ذہن کی تربیت نہ کی

جائے ۔ اور ہمارے ہاں ابھی تک خواص کے ذہنوں کی تربیت کا بھی کسی کو خیال نہیں آیا چہ جائیکہ عوام کے ذہنوں کی تربیت کی جاتی! ہمارے ہاں کا ذی احساس طبقہ برسوں سے چلا رہا تھا کہ ہمارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے جو پروگرام نشر یا کاسٹ کئے جاتے ہیں، ان میں (افادیت تو ایک طرف) عوام کے لئے کشش کا سامان بھی نہیں ہوتا۔ عوام ان سے (BORE) ہو جاتے ہیں۔ ان میں کشش پیدا کیجئے۔ لیکن ان کے "نقار خانہ" میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ انہوں نے اپنا فریضہ ڈیوٹی بجا لانے تک محدود سمجھا۔ اس سے انہیں کچھ غرض نہ تھی کہ اس "ڈیوٹی بجا لانے" کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے یا نہیں۔ آہستہ آہستہ ڈیوٹی بجا لانے کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اور ان کی تمام مساعی یا تو سفارشیوں یا افسرانِ بالا کی خوشنودی میں محصور ہو کر رہ گئیں۔ جنہیں کہیں سے فہمائش ہوئی کہ پروگرام بے کیف (BORE) ہو رہے ہیں انہیں دلچسپ بنائیے، تو انہوں نے فحاشی کے سامان میں کچھ اور مسالہ (مصالحہ) ڈال دیا کہ انکے نزدیک پروگراموں میں کشش پیدا کرنے کا واحد طریق جنسی جذبات میں اشتعال پیدا کرنا تھا۔ جنسی جذبات کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں ابھارنے کے لئے جو طریق بھی اختیار کیجئے، کچھ عرصہ کے بعد وہ "باسی" (STALE) ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس میں مزید تیز آب ملانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے، حتیٰ کہ یہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جب یہ تمام حربے ناکارہ رہ جاتے ہیں، اور رقابت سے معذرت (یکسانیت) کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں - آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔

آپ نے دیکھا نہیں کہ یورپ (اور اس کی دیکھا دیکھی، دیگر اقوام نے بھی) عورت کے پیکرِ مستور کی عریانی کو جنسی جذبے کے محرک کا ذریعہ بنایا۔ ساق بلوریں اور ساعد سیمیں سے اس کی ابتدا ہوئی، اور تھوڑے تھوڑے کے بعد، ہر منظر کے بے کیف ہو جانے پر یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ نوبت از فرق تا بقدم عریانی تک پہنچ گئی۔ اور اب وہاں کے تماشہ خیز اس فکر سے پریشان ہیں کہ اس کے بعد کیا کریں! ہمارے مقلدینِ مغرب نے بھی ٹیلی ویژن (اور سینما) کے پروگراموں کو پرکشش بنانے کے لئے یہی ذریعہ اختیار کیا۔ چونکہ مقلد امام سے پیچھے ہوتا ہے اس لئے ہم ابھی اس سفر کی آخری منزل تک تو نہیں پہنچے لیکن اپنے عوام کو لئے جا رہے ہیں اسی راستہ پر۔

بھارت، ہمارے عوام اور ان کی تفریح کا سامان بہم پہنچانے والے خواص کی ان کیفیات کا بنظرِ غائر مطالعہ کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلے تو یہ پراپیگنڈہ کیا کہ اس کے ہاں کی فلموں اور تماشوں میں زیادہ شوخ و شنگ سامانِ تعیش ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا علاج یہ سمجھا گیا کہ ان کی فلموں پر پابندی لگا دی، اور آج تک کسی نے نہ سوچا کہ بچوں (اور عوام) کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جس بات سے انہیں روکا جائے، وہ ان کے لئے زیادہ وجہ کشش بن جاتی ہے۔ ان حالات میں آپ خود سوچئے کہ بھارت نے جب امرتسر ٹیلی ویژن کو بے نقاب کیا تو وہ کونسا امر تھا جو ہمارے عوام کو اس کی طرف لپک کر جانے سے روک دیتا۔ وعظ و نصیحت؟ ان "واعظانِ مشفق اور ناصحینِ مخلص" سے کوئی پوچھے کہ خود ہمارے ہاں کی وہ کونسی کشش ہے جس سے روکنے میں وعظ و نصیحت کارگر ہوئی ہے جو آپ اس جدید کشش کو پند و نصائح سے روکنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وعظ و نصیحت بھی محض "ڈیوٹی بجا لانا" ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس خطرہ کا علاج بہت پہلے سے شروع کرنے کا تھا۔ اور وہ تھا عوام کی ذہنی تربیت۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جو بچے جو ڈگڈگی کی آواز پر دیوانے ہو جاتے تھے، جب مناسب تعلیم و تربیت سے ان کے ذہنوں میں پختگی آ جاتی ہے تو ان کشش

سے بیگانہ وار گذر جاتے ہیں۔ اور یہ سبق ہمیں خود قرآن کریم سے ملتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ حضور نبی اکرمؐ کی مجلس ہے اور اس میں سامعین بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو نو آموز ہیں۔ ہنوز ان کے قلب و دماغ کی تربیت نہیں ہوئی۔ اتنے میں باہر سے ڈگڈگی کی آواز آجاتی ہے' اور یہ' حضورؐ کو وہیں چھوڑ کر کھیل تماشے کی طرف بھاگ اٹھتے ہیں۔ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا - (۶۲/۱۱) "جب یہ لوگ کھیل تماشا' یا کاروبار کی آواز سنتے ہیں تو اس کی طرف لپک کر جاتے ہیں اور تجھیں کھڑے کا کھڑا چھوڑ دیتے ہیں" اسکا علاج یہ نہیں بتایا کہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھاؤ۔ کہا کہ اسکا علاج یہ ہے کہ انہیں بتاؤ کہ یہاں بیٹھنے سے تمہیں جو کچھ ملے گا وہ کھیل تماشا اور کاروبار کی کشش سے کہیں زیادہ' نفع بخش اور جاذب حیات ہوگا۔ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ۔ (۶۲/۱۱) لیکن یہ "بتانا اور سمجھانا" خالی وعظ و نصیحت سے نہیں تھا' تعلیم و تربیت سے ان کا ذاویۂ نگاہ بدل دینے سے ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس سورہ (سورۃ الجمعۃ) میں مندرجہ بالا واقعہ کا ذکر آیا ہے اس میں حضورؐ کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (۶۲/۲) فریضہ رسالت تھا' انکے سامنے قرآن پیش کرنا۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دینا' اور اس طرح ان کے قلب و دماغ کی تربیت کرنا۔ اس تعلیم و تربیت نے ان کی کسطرح قلب ماہیت کر دی تھی اس کا اندازہ اس قسم کے واقعات سے لگایئے کہ جب مسلمانوں نے حمص فتح کیا تو وہاں کے رومی حکام نے شہر کے بازاروں کی بعض دکانوں پر اپنی نوخیز' حسین و جمیل لڑکیاں بٹھا دیں کہ فوجی سپاہیوں کو ورغلانے کے لئے یہ حربہ بڑا کارگر ہوتا ہے۔ یہ "صحرا نشین" سپاہی ان بازاروں سے گذر کر باہر کیمپوں میں چلے گئے۔ ان میں سے کسی نے یونہی تذکرہ' رومی افسر سے پوچھا کہ تمہارے ہاں کی عورتیں گھروں میں رہتی ہیں یا کاروبار میں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا تم ہمارے شہر کے بازاروں میں سے نہیں گذرے اور وہاں دکانوں پر نگاہ نہیں ڈالی! سپاہی نے کہا کہ نہیں! ہمیں تعلیم یہ دی گئی ہے کہ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴/۳۰) "اپنی نگاہوں کو بیباک نہ کیا کرو' اس لئے ہم بلا مطلب ادھر ادھر نہیں جھانکا کرتے۔ اس افسر نے' اس سپاہی سے تو کچھ نہ کہا' اپنے افسران بالا کو رپورٹ بھیجی کہ جس قیمت پر بھی ہو' ان لوگوں سے صلح کر لو۔ ان پر ہمارا کوئی جادو نہیں چل سکتا۔ یہ لوگ' حضرت خالد بن ولیدؓ کے الفاظ میں "شہادت کو دلہن سے بھی زیادہ پرکشش سمجھتے ہیں"

ہم اپنے ان ناصحین مشفق سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے عوام (بلکہ اپنی نئی نسل) کی وہ کونسی تعلیم و تربیت کی ہے جس سے آپ ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی کششوں سے مستانہ وار آگے بڑھ جائیں؛ قوم کو ناتربیت چھوڑنا اور پھر توقع یہ کرنا کہ وہ بھارت کی مہیا اور پیش کردہ جاذبیتوں کے حریف ہو جائیں خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ عوام کی تربیت کرنا تو ایک طرف' ہم نے انہیں خود فحاشی اور بیباکی کی فضاؤں کا خوگر بنا رکھا ہے۔ وہ جہاں بھی اس سے زیادہ پرکشش ذہنی عیاشی کا سامان پائیں گے' لپک کر اس کی طرف جائیں گے۔ عوام تو ایک طرف' ہمارے تو خواص بھی کسی کشش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مقناطیس ہے جس کی طرف وہ کشاں کشاں کھنچے چلا جا رہا ہے۔

اب آیئے ارباب دانش کی طرف۔ ہمیں امرتسر والوں سے شکایت یہ ہے کہ وہاں سے یہ پراپیگنڈہ نشر کیا جاتا ہے۔ کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔ قومیت کا معیار وطن یا کلچر کا اشتراک ہوتا ہے، مذہب کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کا تصور' اور اس تصور کی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم غلط اقدام تھا۔

ہم پوچھتے ہیں اپنے ارباب حل و عقد سے، جنہیں بھارت سے یہ شکایت پیدا ہو رہی ہے، یا کم از کم وہ اس کا اظہار کر رہے ہیں، کہ کیا خود پاکستان کے "دانشوروں" کی طرف سے ایک عرصہ سے یہی پراپیگنڈہ نہیں ہو رہا؟ کیا یہاں بھی کلچر اور زبان کی بنیادوں پر جداگانہ قومیتوں کا پرچار نہیں کیا جا رہا؛ کلچر کے متعلق قوم کو بتایا جاتا ہے کہ وہ ہڑپا، ٹیکسلا اور موہن جوڈارو کے کھنڈرات میں دبا پڑا ہے۔ ان کھنڈرات سے جس کلچر کے آثار برآمد ہوتے ہیں، وہ بعینہٖ وہی ہے جس کے آثار الورا کی غاروں اور کانگڑہ کی پہاڑیوں سے برآمد ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے، ہمیں یاد رکھایا جاتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے کلچر کی اصل اور بنیاد ایک ہے۔

یہ تو رہا قدیمی کلچر۔ اسکے جدید مظاہر ڈرامہ، رقص، موسیقی، مصوری قرار دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ وہ مظاہر ہیں جو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں یکساں ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہ وہاں، ہمارے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ (ADVANCED) ہیں۔

اب سوچئے کہ جب قومیت کا معیار قرار پایا کلچر؛ اور کلچر پاکستان اور ہندوستان کا ٹھہرا مشترک، تو ان دونوں کے ایک قوم تسلیم کئے جانے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے؟ امرتسر ٹیلی ویژن اس سے زیادہ کیا کہتا ہے؟ وہ ہمیں مخاطب کر کے یہی کہتا ہے کہ تم اپنے ہاں کے رقص، موسیقی، ڈراموں کو دیکھو اور پھر ان پر نظر ڈالو جو یہاں سے پیش ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد خود ہی فیصلہ کرو کہ ان دونوں میں کوئی فرق بھی ہے؟ پھر وہ آگے بڑھے۔ ایک شام پاکستانی شاعر فیض کے ساتھ کا منظر دکھایا، اور ایک مشاعرہ ہندوستانی شعرا کا، اور پھر پوچھا کہ ان دونوں کے خیالات میں کسی قسم کا تضاد و تزاحم تو ایک طرف، اختلاف تک بھی دکھائی دیتا ہے؟ پھر انہوں نے کہا کہ اپنے ہاں کے لباس وضع قطع، طرز بود وماند کو دیکھو اور ایک جھلک اِدھر کی دیکھ لو۔ کیا ان دونوں میں تمہیں کوئی تفاوت نظر آتا ہے؟

پھر کہا کہ تم اپنی زبان (پنجابی) کو دیکھو اور جو بولی ہم بول رہے ہیں اسے سن لو۔ کیا ان دونوں میں کوئی تضاد ہے، تم بابا فریدؒ اور بلھے شاہ کی کافیاں سنو اور ہمارے گردوؤں کے شبد سماعت کرو، کیا تم ان کی تعلیم اور رنگ میں کوئی فرق پاتے ہو۔

وہ یہ کچھ کہتے ہیں اور اس کے بعد، نہایت سادگی سے پوچھتے ہیں، کہ جب یہ سب کچھ، جسے تم معیار قومیت قرار دیتے ہو، مشترک ہے تو پھر خود ہی فیصلہ کرو کہ ہم اور تم دو الگ الگ قومیں کس طرح بن سکتے ہیں؟ یہ انگریز کی چال تھی جس کے فریب میں ہم آ گئے اور آپس میں خون خرابہ کرنے لگ گئے۔ کہو کہ تم کب تک اس فریب میں رہو گے؟ ان کے ایک شاعر کی تشبیہ کی رو سے، یہ تقسیم و تفریق، سر کے بالوں کی مانگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ کیا مانگ سے بال الگ الگ نوعیت کے ہو جاتے ہیں! مانگ کا کیا ہے۔ کنگھی کو ذرا اُدھر لے جا کر نئی مانگ نکال لو۔ ہم اور آپ ایک ہو جائیں گے۔

ہم پوچھتے اپنے ارباب فکر و دانش اور ارکان نظم و نسق سے کہ جب ہمارے ہاں معیار قومیت کے متعلق برسوں سے یہی کچھ کہا جا رہا ہے تو پھر امرتسر ٹیلی ویژن نے ہمیں کونسا "جھٹکا" کھلا دیا ہے جس پر اس قدر واویلا کیا جا رہا ہے؟ اصل یہ ہے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہاں ہو یہ رہا ہے کہ کوئی حادثہ رونما ہو، بجائے اس کے کہ اس کے حقیقی اسباب و علل پر غور کیا جائے، قوم کو جذبات میں الجھا دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نگاہ اس طرف

اٹھنے دیلئے کہ ان حوادث کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ امرتسر ٹیلی ویژن یا بھارتی پراپیگنڈہ کے دیگر ذرائع ابلاغ اگر اہلِ پاکستان کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں، بتاہیں، بجائے اس کے کہ ہم ہندوؤں اور سکھوں کو کوسیں، نہیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ ہم سے کیا کوتاہیاں اور غلطیاں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، جن کی وجہ سے ان کا پراپیگنڈہ کامیاب ہو رہا ہے۔

ہمارے لئے اشد ضروری تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، اپنے سامنے ایک واضح اور متعین پروگرام رکھتے اور اس پر مسلسل اور متواتر عمل پیرا ہوتے۔ اس پروگرام کی رو سے ہمیں چاہیئے تھا کہ،

(۱) ملک کے تمام ذرائع ابلاغ سے کام لیکر اس حقیقت کو عام کرتے، اور اپنی نئی نسل کو نصاب کی کتابوں میں اسے واشگاف کرتے کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا۔ اس مطالبہ کی اساس و بنیاد کیا تھی۔ اس کی تشکیل سے مقصود و مطلوب کیا تھا۔

(۲) ہم بتاتے کہ اسلام کی رُو سے معیارِ قومیت، دین کا اشتراک ہے اور اس کے مقابلہ میں وطن، کلچر، زبان، رنگ، نسل کا اشتراک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس معیار کی رُو سے، تمام مسلمان، بحیثیت مسلمان، ایک قوم کے افراد ہیں، اور کوئی غیر مسلم اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا خواہ وہ ہمسایہ چھوڑ، حقیقی بھائی بھی کیوں نہ ہو۔

(۳) ہم بتاتے کہ ایک جداگانہ مملکت کی تشکیل کا جذبۂ محرکہ نہ معاشی تھا نہ سیاسی۔ یہ ہمارے دین کا تقاضا اور اسلام کا مطالبہ تھا۔ اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہم اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا پاکستان کا قیام، واستحکام و بقا، ہمارا جزوِ ایمان ہے۔

(۴) ہم اپنی قوم۔ بالخصوص نئی نسل۔ کو بتاتے کہ ہندو کیا ہے۔ وہ کسطرح مسلمانوں ہی کا نہیں، اسلام کا دشمن ہے۔ اس نے تحریکِ پاکستان کی کسقدر مخالفت کی اور اسے ختم کر کے پھر سے اکھنڈ بھارت (ایک ہندوستان) قائم کرنے کے لئے ان کے عزائم کیا ہیں۔

(۵) ہم انہیں بتاتے کہ سکھ، مسلمانوں کے کسقدر جانی دشمن ہیں۔ انہوں نے (ماضی میں تو ایک طرف) تقسیم ہند کے وقت ہمارے ساتھ کیا کیا تھا۔ ہمارے بیکس و بے بس، نہتے قافلوں کو کسطرح لوٹا، تہ تیغ کیا، اور ہماری عصمتوں کو برباد کیا۔ قوم کی کتنی عصمت مآب بیٹیاں آج بھی ان کے گھروں میں ان کی درندگی کا شکار ہو رہی اور ہماری بے حسیتی کا ماتم کر رہی ہیں: ضروری تھا کہ ہم ان (سکھ سورماؤں) کی دہشت و بربریت کی خونچکاں داستانیں اپنے بچوں کو سناتے اور ان کی یاد، بڑوں کے ذہن میں، تازہ کرتے رہتے۔

ہم اپنی قوم کو یہ کچھ التزاماً بتاتے اور اس حقیقت کو ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست کراتے کہ مسلمان کے لیے جسطرح خنزیر کا گوشت حرام ہے۔ اسی طرح ان لوگوں (ہندوؤں اور سکھوں) سے دوستداری کے تعلقات بھی حرام ہیں۔ ہم قوم کے دل میں یہ جذبہ بیدار رکھتے اور اس کے بعد دیکھتے کہ جس سامانِ تعیش کو، امرتسر ٹیلی ویژن کے پردہ پر پیش کر کے ہماری قوم کے لئے وجہ کشش بنایا گیا ہے، اگر اسے وہ لوگ سچ مچ محسوس پیکروں میں بھی ادھر بھیجدیتے تو بھی ہماری غیور و جسور قوم کا کوئی فرد انکی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ جذبہ میں کتنی بڑی قوت ہوتی

ہے آپ اسکا تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو امرتسر والوں سے کہئے کہ وہ جن کنیاؤں (دوشیزگان) کو پردۂ سیمیں پر پیش کرکے یہاں کے مسلمانوں کو ورغلانا چاہتے ہیں، انہیں خود یہاں بھیجئے اور ان سے کہئے کہ وہ اپنی ہزار عشوہ سامانیوں اور کرشمہ سازیوں سے "ٹی۔ وی کے انہی تماشائیوں میں سے کسی ایک" سامنے "کو جھٹکے کے گوشت کی ایک بوٹی کھلا کر بتائیں! وہ ایسی پیشکش کرنے والی کے منہ پر تھپڑ مار کر اس کے دانت باہر نکال دیگا؟ یہ تھا وہ جذبہ جو، جھٹکے کے گوشت سے آگے بڑھ کر، جھٹکے کا گوشت پیش کرنے والوں کے متعلق ہماری قوم کے دل میں موجزن رہنا چاہئے تھا۔ اس سے قوم کے دل میں یہ احساس بیدار نہ ہو سکتا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی یہ پیشکش، کہ ہم اور پاکستانی مسلمان بھائی بھائی ہیں، ہمیں پھر سے مل جانا چاہیئے، جھٹکے کے گوشت سے کم نفرت انگیز نہیں۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ ہمارے وہ "دانشور" جو وسیع النظری اور کشادہ ظرفی کے لبادہ میں پاکستان کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں، چلّا اٹھیں گے کہ قوم کو نفرت کی تلقین کرنا، مذہب کے خلاف ہے۔ لیکن ہم انہیں کسطرح بتائیں کہ جو "مذہب" ہمیں خدا کی طرف سے ملا ہے وہ ہمیں تاکید کرتا ہے کہ تم دنیا بھر کے دشمنانِ اسلام سے برملا کہدو کہ:

إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ز
كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ
أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ... (۶۰/۴)

ہم، تم سے، اور جنہیں تم خدائے واحد کو چھوڑ کر خدا بنائے ہوئے ہو، قطعاً بیزار ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ (ہر قسم کے تعلقات دوستداری سے) علانیہ انکار کرتے ہیں۔ تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بغض اور عداوت ہے، اور یہ بالکل کھلی کھلی بات ہے جسے ہم چھپا کر نہیں رکھنا چاہیئے۔ تم میں اور ہم میں باہمی مودّت اور محبت کے تعلقات اسی صورت میں ممکن ہیں جب تم بھی ہماری طرح خدائے واحد پر ایمان لے آؤ۔

اگر ایسا نہیں تو تمہارے ساتھ ہمارے تعلقات باہمی معاہدات کی رو سے طے پائینگے۔ قلبی دوستداری کے تعلقات کبھی استوار نہیں ہو سکیں گے۔ نہ ہم اور تم ایک قوم بن سکیں گے۔ اس باب میں ہمارا مسلک وہی ہے جسے (مولانا) محمد علی جوہرؒ نے ان انقلاب انگیز الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے - یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے۔

اور یہی ہے امرتسر ٹیلی ویژن کے پراپیگنڈہ کا صحیح جواب — لیکن

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب، اور کدھر سے
مسکیں ز لکم ماندہ دریں کشمکش اندر

---

(۲)

اس ماہ ہی کا نہیں بلکہ اس سال کا سب سے اہم واقعہ ممالک عربیہ اور اسرائیل کی جنگ کی تجدید ہے۔ اسرائیل کا مسئلہ

جس نے سارے مسلم ممالک کو کسی نہ کسی نوع سے، وقفِ اضطراب بنا رکھا ہے، اس کے سوا کیا ہے کہ وہ امت جسے قرآن نے، ایمان کی اشتراک کی بنیادوں پر، امتِ واحدہ (ایک قوم) بنایا تھا، جغرافیائی حدود، سیاسی حدود، یا نسلی تفریقات کی (دورِ جاہلیت) کی بنیادوں پر، مختلف قوموں میں بٹ گئی۔ یہ امت، امتِ واحدہ تھی تو (حضور نبی اکرم کے ارشادِ گرامی کے مطابق) اس کی مثال جسدِ واحد کی سی تھی کہ اس کے کسی ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم مبتلائے کرب والم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ مختلف امم میں تقسیم ہو گئی تو ہر عضو کا درد، بس اسی کا درد بن کر رہ گیا۔ دوسرے اعضا نے اس سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ آپ سوچئے کہ اگر عرب ممالک امتِ واحدہ ہوتے تو یہ بات کسی کے وہم و خیال میں بھی آ سکتی تھی کہ دنیا بھر کی ٹھکرائی اور دھتکاری ہوئی قوم (اسرائیل) کے مٹھی بھر افراد، اس جسد کے قلب میں خنجر گھونپ دیتے اور کسی کی آنکھ سے آنسو تک نہ ٹپکتا! ہم کہتے ہیں کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ عبرت آمیز اور غم انگیز نظارہ کبھی نہ دیکھا ہو گا۔ وہ اعضاء خنجر گھونپ کر آرام سے بیٹھ گئے اور اس کے بعد اس خنجر کے نکالنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں، نہ صرف یہ کہ ناکام رہیں، بلکہ اس خنجر کو اور گہرا لی تک لے جانے کا موجب بنتی گئیں۔ ہم ان ناکامیوں کے اسباب کی تلاش، کبھی اسرائیلیوں کے لئے امریکی حمایت، اور کبھی مصریوں کے ساتھ روس کی سازش میں کرتے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقی وجہ نہ یہ ہے نہ وہ۔ اس کی حقیقی وجہ ایک ہی ہے۔ اور وہ وہی جسے قرآن کریم نے ان زندہ جاوید الفاظ میں بیان کیا تھا کہ وَلَا تَنَازَعُوْا۔ دیکھنا! تم آپس میں الجھنے اور جھگڑنے نہ لگ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو فَتَفْشَلُوْا۔ تمہارے دل کمزور اور حوصلے پست ہو جائیں گے۔ وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (۸/۴۶) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ہماری تاریخ کے ابتدائی دور میں تو یہ تنازعات وقتی اور ہنگامی ہوتے تھے لیکن بعد میں یہ (امتِ واحدہ رہنے کے بجائے) مختلف قوموں میں بٹ گئے تو ان تنازعات کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔ حکیم الامت کے الفاظ میں۔

اے کہ بودی، امم گردیدۂ

بس یہ ہے ہماری تمام مصیبتوں اور حرماں نصیبیوں کی حقیقی وجہ۔ اور

علاج اس کا؟ ــــــ وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

یاد رکھیئے! ہم دو، بیس، چھوڑ، سو ہزار قوموں میں بھی کیوں نہ بٹ جائیں، جہاں تک غیر مسلموں کے جذبہ عداوت و انتقام کا تعلق ہے، وہ ہم سب کو ایک ہی قوم سمجھتے ہیں۔ وہ ہم سب کے یکساں دشمن ہیں، اور کسی ایک کے بھی دوست نہیں۔ اس میں نہ روس کی تخصیص ہے، نہ امریکہ کی۔ نہ فرانس کی تمیز ہے نہ برطانیہ کی۔ الکفر ملة واحدة۔ مسلمانوں کے خلاف سب متحدہ محاذ میں شریک ہوتے ہیں۔ کوئی کھلے بندوں اور کوئی چوری چھپے۔ ہم آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں، اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم قومیت کے (دورِ جاہلیت کے) معیاروں کے بجائے، اس اسلام کو معیار قومیت قرار دے لیں جس کے ہم نام لیوا ہیں۔ ہماری حالت عجیب ہے۔ اسلام کی طرف نسبت سے ہم دنیا بھر کی مخالفتیں اور ان کی پیدا کردہ مصیبتیں تو مول لیتے ہیں، لیکن اسلام کو شعار زندگی بنا کر اس کی برکتوں اور سعادتوں سے متمتع نہیں ہوتے۔ یہ ہے وہ دوہرا عذاب جس میں ہم صدیوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ہم شباشب امم متفرقہ سے امتِ واحدہ نہیں بن سکتے، لیکن، اس کی ابتدا کرنے کے لئے، اگر تمام مسلم ممالک (کم از کم) اپنی خارجہ پالیسی ایک قرار دے لیں۔ یعنی ہم میں سے کسی ایک کا دشمن، سب کا دشمن ٹھہرے۔ تو اس سے بھی ہمارے کئی دکھ دور

ہو جائیں گے۔ اگر اسرائیل کے ساتھ موجودہ جنگ، ہمیں ایک قدم بھی اسطرف آگے لے جائے تو ہم سمجھیں گے کہ عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد، حقیقت بن جائے گی۔

چونکہ یہ جنگ ابھی جاری ہے اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ اس کا آخری فیصلہ کیا ہوگا، لیکن اصولاً ایک بات واضح ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ جنگ اس شرط پر بند کرا دی جائے کہ تمام فوجیں ۱۹۶۷ء کے خط متارکہ پر آ جائیں۔ مغربی اقوام کا یہ حربہ ایسا ہے جس نے ہمیں ہر مقام پر ہزیمت خوردہ بنا دیا ہے۔ اسی مسئلہ اسرائیل کو لیجئے۔ اسرائیل نے بربنائے دھاندلی سے مسلمانوں (عربوں) کے ایک علاقہ پر قبضہ کر کے، اس میں اپنی مملکت قائم کر لی۔ عربوں نے اپنے اس علاقہ کو واگذار کرانے کے لئے صلح و آشتی کی ہزار کوششیں کیں لیکن جب وہ اس میں ناکام رہ گئے تو انہیں مجبوراً جنگ کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ بدنصیبی کہ اس میں انہیں شکست ہوئی اور اسرائیل نے ان کا مزید علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ عرب اب، اپنے مقبوضہ علاقہ کو واگذار کرانے کے لئے پھر اٹھے ہیں تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم، اسرائیل کا اس علاقہ کے متعلق تو بات تک بھی نہ کرو جس پر انہوں نے غاصبانہ قبضہ کر کے اپنی مملکت قائم کر لی تھی۔ اسے طے شدہ سمجھو اور جائز مسئلہ تسلیم کر لو اور جس علاقہ پر انہوں نے سابقہ جنگ میں قبضہ کر لیا تھا۔ اسے مابہ النزاع سمجھو لیکن واگذار اسے بھی نہ کراؤ۔ اسکا فیصلہ ہم اپنی مصلحت کے تابع کسی وقت کریں گے۔ آپ سوچئے کہ اس تجویز میں حق و انصاف کا شائبہ تک بھی ہے؟ اسرائیل کا اوّلین قبضہ بھی اسی طرح دھاندلی پر مبنی تھا جسطرح دوسرا قبضہ۔ عربوں کا اس پورے علاقہ پر حق ہے، اور وہ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لئے جو کوشش بھی کریں، دنیا کے ہر حق پرست کا فریضہ ہے کہ وہ اس میں ان کی ہر ممکن مدد کرے اور انہیں ابلیس مغرب کی دسیسہ کاریوں سے بچائے۔ ہم خود اقوام مغرب کی اسی ابلیسی سازش کے شکار ہیں۔ ہم سے کبھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر پر بھارتی غاصبوں کا حق تسلیم کر لو۔ کبھی زور ڈالا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان پر باغیوں کے قبضہ کو جائز مان لو۔ ان کی ان ریشہ دوانیوں کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

اور ہمارا "ایک ہونا" اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم قرآن کے مقرر کردہ، معیار قومیت پر عمل پیرا ہو جائیں۔ (حریت (۱۵) اکتوبر)

(بقیہ "عید آزاداں، عید محکوماں" صفحہ ۴۱ سے آگے)

میں نے قرآنی نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ محض الفاظ کی بندش اور شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ میرے نزدیک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ نظام کیا ہے۔ کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ یہ سب کچھ قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔

پرویز

(افسوس ہے کہ عدم گنجائش کے باعث باقی تقاریر درج نہیں کی جا سکیں)

عیدِ آزاداں ــــــ عیدِ محکوماں

ابھی ابھی رمضان المبارک کا مہینہ بھی گذرا ہے، اور اس کے آخر میں عید الفطر کا تیوہار بھی۔ ان دنوں آپ نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر رمضان المبارک کے فضائل اور عید کی برکات پر تقریریں سنی ہوں گی۔ یہ تقریریں آپ اسلامی مملکتِ پاکستانیہ کے آزاد ذرائع ابلاغ سے چھبیس سال سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ تقریریں کیا ہوتی ہیں؟ ایک رسم کی ادائیگی جس میں کوئی روح نہیں ہوتی۔ تقریریں کرنے والے انہیں اپنی "افیشل ڈیوٹی" سمجھ کر بیگار ٹالتے ہیں۔ تقریریں کرنے والے اس لئے تقریریں کرتے ہیں کہ اسکا انہیں کچھ معاوضہ ملتا ہے۔ اور سننے والے انہیں اس لئے سنتے (یا سن لیتے) ہیں کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ نہ کسی کو ان تقاریب کی معنوی حیثیت سے کچھ واسطہ ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ غرض کہ ہماری عملی زندگی سے ان کا کیا تعلق ہے۔

ہم طلوعِ اسلام کے پرانے فائلوں کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ ان میں لیلۃ القدر۔ اور عید کی تقاریب پر تین تقریریں ہماری نظر پڑیں۔ ان میں دو تقریریں پرویز صاحب کی تھیں اور ایک علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) کی، اور نشر ہوئی تھیں، ۱۹۴۰ء میں، آل انڈیا ریڈیو دہلی سے۔ اس زمانے میں سلطنت انگریز کی تھی اور حکومت عملاً ہندو کی جن کا ریڈیو پر کامل تسلط تھا۔ اور تقریر کرنے والے، پرویز صاحب، خود اس حکومت کی ملازمت میں تھے۔ آپ ان تقریروں کو دیکھئے جو ہماری محکومی زمانے میں انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتی تھیں اور پھر ان تقریروں کو سامنے لائیے جو مملکتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے آزاد ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد اگر آئینہ پاس ہو تو اس میں اپنی صورت دیکھئے۔ طلوعِ اسلام۔

پہلی تقریر

لیلۃ القدر دنیا کی کسی قوم کو لیجئے۔ سال میں کچھ دن ایسے آئیں گے جن میں وہ جشن و مسرت کے تیوہار منائے گی۔ جب دنیا میں مسلمان آئے تو ان کے ذمے عدل و انصاف کے پھیلانے اور جور و استبداد کے مٹانے کیلئے ایسے اہم فرائض عائد کئے گئے کہ انہیں فرصت ہی نہ تھی کہ وہ اس قسم کے مسرت و شادمانی کے جشن منائیں۔ لیکن اس کے باوجود انکی داستانِ زندگی میں بعض واقعات ایسے تھے جن کی یاد قائم رکھنا اقوامِ عالم کی موت و حیات کے اصولوں کی یاد تازہ کرنا تھا، یہ اس ملت کے تیوہار ہیں۔ اور ان تیوہاروں میں سب سے نورانی وہ جس کا مطلع ہلالِ رمضان

اور مقطع روزِ عید ہے۔ جس عظیم الشان واقعہ کی یاد میں یہ تیوہار منایا جاتا ہے اس کی عظمت و رفعت خود بتا دے گی کہ اس تیوہار کو کتنا اہم ہونا چاہیئے۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کیلئے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اپنے رسول بھیجے جو لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہے۔ لیکن خدا کے یہ پیغامات اپنی اصلی شکل میں کہیں محفوظ نہ رہ سکے۔ کہیں یہ زمانے کے انقلابات کے ہاتھوں مٹ گئے اور کہیں خود انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کی صورت مسخ کر دی۔ اب ذرا تصور میں لائیے ایسے منظر کو کہ نگاہیں ذوقِ نظارہ کے لئے بیتاب ہوں، لیکن دنیا سے روشنی گم ہو جائے۔ زندگی کا مدار صاف ہوا پر ہو لیکن فضا مہلک جراثیم سے بھرپور ہو جائے۔ جانِ ناتواں پیاس کی شدت سے پھڑک رہی ہو لیکن پانی کے ہر چشمے میں زہر مل چکا ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اگر یکایک سورج بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے۔ اس مہلک فضا کی جگہ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکے نزہت و لطافت کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے ایک نئی زندگی کا سامان پیدا کر دیں۔ ان زہر سے بھرے ہوئے چشموں کی جگہ ایک جوئے رواں مچلتی، لوٹتی، مسکراتی دامنِ کہسار سے تازہ و لونوں کی بشارتیں لئے بڑھتی چلی آئے۔ تو فرمائیے کیا یہ واقعہ ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی یاد اس وقت تک قائم رکھی جائے جب تک دنیا میں زندگی کے قیام و بقا کے لئے نفیس روشنی، لطیف ہوا اور صاف پانی کی ضرورت ہے؟ یہ آفتاب جہانتاب، یہ نسیم حیات پرور، یہ کوثر و تسنیم کی جوئے رواں ہمارے اللہ کا وہ پیغام ازلی ہے جو قرآن کریم کی شکل میں دنیا کو اس وقت ملا جب حیاتِ انسانی کے ہر شعبے پر مُردنی چھا چکی تھی اور زندگی کی تاریک رات میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ اسلئے مسلمانوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر جشن و مسرت کی تقریب اور کوئی نہیں۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ. قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۔ (۱۰/۵۷-۵۸)

اے انسانو! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسا زندگی عطا کرنے والا پیغام آگیا (جو سرتاپا) نصیحت ہے۔ دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا۔ اور ہدایت و رحمت ہے ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اے رسول تم ان سے کہدو کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اسکی رحمت۔ پس چاہیئے کہ اس پر خوشی منائیں (یہ قدرت کا عطیہ) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جسے یہ لوگ دنیا میں جمع کرتے رہتے ہیں۔

یہ ہے وہ نورِ مبین جس سے رمضان کے مہینے میں حکیم انسانیت نے بینائی حاصل کی۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۔ (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کا نزول ہوا وہ قرآن جو انسان کیلئے راہ نما ہے۔ ہدایت کی روشن صداقتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہے۔

اور اسی پاک مہینے میں وہ مبارک رات ہے جس میں نورِ خداوندی کی پہلی جھلک سے دنیا کی نگاہیں آشنا ہوئیں۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۔ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۔ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ٥ (۹۷/۱)

ہم نے اس کتاب مبین کو عظمتوں والی رات میں نازل کیا ہے۔ تم کیا جانو کہ یہ عظمتوں والی رات کیا ہے؟ وہ رات جو اپنی قدر و قیمت میں ہزار مہینوں سے افضل ہے جس رات میں فرشتے اور جبریل امین اپنے رب کے فرمان کے بموجب امن و سلامتی کی جنت اپنے آغوش میں لئے دنیا پر نازل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیا نورِ سحر سے جگمگا اٹھتی ہے۔

اس مقدس رات میں اللہ تعالیٰ کے اس ضابطۂ قوانین کا نزول شروع ہوا جس کا ایک ایک لفظ سراپا حق و یقین ہے۔ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ (۶۹/۵۱) جس میں کہیں کسی جگہ شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں۔ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا (۴۱/۴۲) حق کہتے ہی اسے ہیں جو ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ امٹ ہو۔ اپنی جگہ پر قائم ہو۔ حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے۔ علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ اور اس کے برعکس باطل وہ جو مٹ جانے والا ہو۔ جو باقی نہ رہ سکے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق ہے۔ باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ علم و دانش ہے۔ توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ کسی خاص ملک خاص قوم اور خاص جماعت کی ہدایت کیلئے نہیں۔ بلکہ نسلی، لسانی، طبقاتی، وطنی، قبائلی حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئینِ حیات ہے۔ پھر جس طرح یہ صحیفۂ فطرت مکانی حدود سے بلند ہے۔ اسی طرح زمانی قیود سے بھی نا آشنا ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں یہ کہہ سے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن کریم بھی یہ کبھی نہ کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا۔ اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو قطعاً نہیں۔ قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جائیے۔ جہاں اندر جہاں، زمانہ در زمانہ ان کے پیچ و خم میں لپٹا ملے گا فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ اس کے متعلق ابتدائی انسان اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں۔ اس کی (LATENT PROPERTIES) زمانہ کی عقل و علم، تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں۔ گویا وہ اس کی تہوں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں آج پانی سے جس قدر کام لئے جاتے ہیں ابتدائی زمانے میں بھی یہ خصوصیتیں پانی کے اندر موجود تھیں اور آج بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پانی کے اندر جس قدر قوتیں خوابیدہ تھیں وہ سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں۔ اس خضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی آج اس میں لاسلکی لہروں نے ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے ایتھر تو پہلے بھی موجود تھا اسی خلا میں لپٹا ہوا اس انتظار میں تھا کہ انسانی علم و دانش کی سطح بلند ہو تو وہ اس کو آن چھوئے اور یہ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالے کر دے۔ یہی کیفیت مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کی ہے۔ زمانہ علم و عقل کی جس سطح تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے قرآن کریم اس سے بھی آگے نظر آئے گا کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں

بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ضابطۂ قوانین ہے۔ مذہب، سیاست، تمدن، تہذیب، معاشرت، معاشیات غرضیکہ دین و دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس کے اندر ہدایت کے اصول موجود نہ ہوں۔ ایسے اصول جو سب سے محکم اور سیدھی راہ دکھانے والے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (پ ۱۵)

بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ متوازن راہ ہے۔

یہی وہ توازن بدوش راہ تھی جس پر چل کر ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی بادیہ نشین قوم دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر و کسریٰ کی دولت و سلطنت کی وارث بن گئی اور دوسری طرف دنیائے جہانداری و جہانبانی میں حسن و اخلاق کے اس مقام تک پہنچ گئی جس کی یاد آج تک دلوں سے محو نہیں ہوئی۔

آج بھی ہم مسلمانوں کے پاس وہی قرآن موجود ہے، اور آج بھی اس کی ویسی ہی تلاوت ہوتی ہے۔ اسی رمضان شریف میں دیکھئے، لاکھوں مرتبہ اسے دہرایا گیا ہوگا۔ پھر کیا ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت عام طور پر ویسی نہیں بنے جیسی پہلے مسلمانوں کی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ قرآن کریم قوانین کا مجموعہ ہے اور قوانین ہمیشہ عمل کرنے کے لئے ہوتے ہیں، محض پڑھنے کیلئے نہیں ہوتے۔ پڑھا انہیں اس لئے جاتا ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ جب یہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہم مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی کہ قدم چلتے ہیں لیکن منزل قریب نہیں آتی، کام ہو رہے ہیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، خود اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے:۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی - (پ ۱۶)

اور جو شخص ہمارے قرآن سے روگردانی کرے گا تو اس پر روزی تنگ ہو جائے گی - اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا اٹھائیں گے۔

آج دنیا دل کے اضطراب اور روح کی پریشانی کے جس جہنم سے گذر رہی ہے، ضرورت تھی کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی زندہ و پائندہ کتاب کا وارث بنایا تھا وہ انسانیت کو اس پریشانی اور اضطراب سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتاتی۔ لیکن دوسروں کو جگانے والے جب خود ہی سو جائیں تو مخلوق کی حفاظت کس طرح ہو۔ راستہ دکھانے والا جب چراغ ہدایت کو دامن میں چھپا لے تو منزل تک کیسے پہنچا جائے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود ہمارے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا چاروں طرف سے تھک تھکا کر خود ہی روشنی کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہی ہے۔ اس لئے روشنی کے علمبردار ماننے کے باتھوں مجبور ہوں گے کہ اللہ کی دی ہوئی روشنی سے تمام پردے اٹھا کر خود بھی راہ راست پر ہوں، اور دنیا کو بھی اطمینان اور سکون کی جنت کا راستہ دکھائیں۔ ہم مسلمانوں نے جب پھر سے ایک مرتبہ قرآن کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو پھر دیکھئے گا کہ ہم جس مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں وہ کس طرح سونا بن جاتی ہے۔ ہماری ہر آرزو کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہو گا کہ لیلۃ القدر کی صحیح عظمت کیا ہے۔ ہم اسکی قدر و قیمت اس وقت پہچانیں گے جب ہمیں قرآن کی قدر ہو گی اور جب قرآن کی قدر ہو گی تو اپنے آپ کی قدر ہو گی اور جب اپنی قدر ہو گی تو قدر و قیمت کے تمام غلط معیار نگاہوں سے گر جائیں گے۔ (باقی صفحہ ۱۰ کے نیچے)

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت جون ۷۳ء حسب ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے

فہرست "الف"

۱۔ محترمہ شمیم نیاز صاحبہ۔ لاہور -/۲۵۰۰

۲۔ محترمہ نرگس ارشد صاحبہ۔ لاہور -/۲۵۰۰

۳۔ میجر محمد افضل مرزا صاحب۔ لاہور -/۲۵۰۰

۴۔ مرزا محمد جمیل صاحب ۔ لاہور -/۱۲۷۵

فہرست "ب"

۵۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال -/۱۰

۶۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور -/۵

۷۔ میجر ایم ذکریا صاحب۔ مری -/۱۰۰۰

۸۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال -/۱۰

۹۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور -/۵

۱۰۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال -/۱۰

۱۱۔ محترم محمد یوسف پغمانی صاحب۔ وزیر آباد -/۲۰

۱۲۔ محترم محمد حنیف صاحب۔ لاہور -/۴۰

۱۳۔ محترم عبد الرحمٰن صاحب۔ لاہور -/۳۲

۱۴۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور -/۵

۱۵۔ محترم علی محمد صاحب۔ جھنگ -/۱۰۰

۱۶۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال -/۱۰

۱۷۔ محترم ظہور الدین صاحب۔ لاہور -/۵

۱۸۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال -/۱۰

۱۹۔ محترم حبیب الزمان و بدیع الزمان صاحب۔ کراچی -/۱۰

۲۰۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور -/۵

۲۱۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال -/۱۰

۲۲۔ محترم عبید اللہ جان میاں صاحب۔ ملکا ڈھیر (پشاور) -/۱۰۰

سابقہ مبلغ -/۱۰۲۵ روپے کا عطیہ پیشتر سے آ چکے ہیں۔

نوٹ:

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۶۵/(K)/۶۵۴ مؤرخہ ۴/۶/۶۵ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان۔ پارٹ II مؤرخہ ۱۳/۶/۶۵ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن D/۱۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ (سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ (رجسٹرڈ) لاہور

کتاب کی قیمت میں اضافہ

ڈاکٹر سید عبد الودود صاحب کی تصنیف (مجلد۔ بزبان انگریزی)

(PHENOMENON OF NATURE AND THE QURAN)

کی قیمت ماہ اکتوبر ۷۳ء کے شمارہ طلوع اسلام میں اعلان (صفحہ ۴۶) کے مطابق -/۲۵ روپے تھی۔ ناشران کتاب مذکور نے اب اسکی قیمت تیس (-/۳۰) روپے مقرر کی ہے۔ خریداران آئندہ کے لئے نوٹ فرمالیں۔

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دوکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز ڈپو

تشریف لائیے

سپیشلسٹ: ٹواج، بیڈفورڈ، لی لینڈ، بی۔ ایل۔ ایم۔ سی
ڈیلرز: موٹر پارٹس۔ ٹرک و ڈیزل پارٹس۔

۱۳۵۔ بادامی باغ۔ لاہور
(ٹیلیفون 69012)

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

کراچی میں۔ ہر اتوار صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ) بمقام دفتر
بزم طلوع اسلام B-25 فردوس مارکیٹ، بالمقابل بس سٹاپ پیپی چورنگی
ناظم آباد کراچی 18۔ ٹیلیفون: ۶۱۰۴۹۸

ملتان میں۔ ہر جمعہ بعد از نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بمقام دفتر
شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ۔ ملتان۔ ٹیلیفون ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں۔ ہر اتوار صبح ۹ بجے
(بذریعہ ٹیپ) بمقام۔ چوہدری محمد دین۔
ٹی سٹال۔ کرسچین ٹاؤن۔ بارہ پتھر
سیالکوٹ ۲۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ
اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ
جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared
and die not except in a state of Islam. And hold fast
all together, by the Rope which God stretches out
for you, and be not divided among yourselves

PREMIER TOBACCO
INDUSTRIES LIMITED

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیامِ عید

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

[پرویز صاحب کا درس قرآن مجید جو (۲۶) اکتوبر ۱۹۷۳ء کی صبح دیا گیا]

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

یوں تو ہمارا ہر درس، درسِ قرآن مجید ہوتا ہے جس میں، میں اپنے علم و بصیرت کی حد تک، خدا کی اِس کتاب عظیم کے حقائق و معارف، اصول و احکام اور قوانین و اقدار، آپ احباب کے سامنے پیش کرتا ہوں، لیکن رمضان کے مبارک و مسعود مہینہ کا آخری درس، التزاماً، اس ضابطہ ہدایت کی عظمت و انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لئے مختص کر لیا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اِس سرچشمۂ نور و بصائر کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس باعظمت مہینہ کا اختتام اُس پُرمسرت تقریب پر ہوتا ہے جسے عید کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، عید درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے جس کے منانے کا حکم خود اس کتاب کے نازل کرنے والے، ربّ العرش، نے دے رکھا ہے۔ جب کہا کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ. (۱۰/۵۸) یہ محض خدا کا فضل اور اسکی رحمت ہے جو اس جیسی کتاب تمہیں مل گئی۔ دنیا کی ہر متاع اسکے سامنے ہیچ ہے۔ لہٰذا، اس عطیہ خداوندی کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔

میں نے اس تقریب انبساط انگیز کے سلسلہ میں، تین سال پہلے ایک درس میں کہا تھا کہ ہم اسی جشن کو ہندوستان میں بھی منایا کرتے تھے لیکن وہ محض ایک رسم تھی جسے پورا کر لیا جاتا تھا ـــــ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کی تقدیر میں جشنوں کی مسرتیں کہاں؟ یہی وہ کرب انگیز حقیقت تھی جسے علامہ اقبال نے ان زہرہ گداز لیکن بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں ـ عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

برسوں کی تگ و تاز کے بعد ہماری محکومی کی زنجیریں ٹوٹیں اور ہمیں آزادی کی فضا میں اذنِ بال کشائی ملا۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق تھا کہ ہمیں یہ نوید آزادی رمضان کے مہینے میں ملی، اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پہلی عید اگست ۱۹۴۷ء میں، اعلانِ آزادی کے تین ہی دن بعد دیکھنی نصیب ہوئی۔ بے شک وہ عید، عیدِ آزاداں تھی لیکن اُس وقت ہم ایک عجیب کشمکش میں گرفتار تھے۔ ایک طرف حصولِ آزادی اور عیدِ آزاداں کے نشاط آفریں اور طرب آگیں احساسات و جذبات

اور دوسری طرف، ہندوستان سے آنے والے ہمارے قافلوں کا قتلِ عام اور بقیۃ السیف، خانماں برباد، متاعِ گم شدہ بھروں کی تباہ حالی اور بے سروسامانی! وہ عید اژدھامِ مسرت و شادمانی کے روح پرور اور ہجومِ مصائب و آلام کے جاں فرسا آمیزہ کی تقریب تھی۔ مجھے وہ نمازِ عید آج تک یاد ہے ——— اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ جسے میں نے کراچی کی بہائی، مختصر سی، عیدگاہ کے باہر، سڑک پر، قائدِ اعظمؒ سے پیچھے اس انداز سے ادا کی تھی کہ سر، حصولِ آزادی کے شکرانہ میں وقفِ سجود تھا، لیکن دل اندوہگینیوں اور ملال آفرینیوں کے ہجوم میں طلسمِ پیچ و تاب۔ نماز کے بعد عید ملنے والوں کے انبوہ میں خود قائدِ اعظمؒ کی بھی یہ کیفیت تھی کہ ——— جگر میں ٹیس لب ملتفنے پہ مجبور۔

اسمیں شبہ نہیں کہ شدائد و نوائب کی جو قیامت ہم پر اُس وقت ٹوٹ پڑی تھی، عید کا چاند اسکے غبار میں گم ہو کر رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود، ہمارے درخشندہ و تابناک مستقبل کی اُمید کی شعاعیں تھیں جو ہمارے تصورات کی راتوں کو تاریک نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اور افق سے اُس پار ندائے جمال تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ لَا تَهِنُوْا ـ وَلَا تَحْزَنُوْا ـ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ـ مت گھبراؤ۔ خوف دکھاؤ۔ فطرت کے اس اٹل قانون پر نگاہ رکھو ——— کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

(جیسا کہ میں نے اُس وقت بھی کہا تھا) اُس عید کی ماتم سامانیوں اور سیاہ پوشیوں کو ہم نے ان تابندہ اُمیدوں کے سہارے برداشت کر لیا، لیکن کس قدر جگر پاش اور جانسوز ہے یہ حقیقت کہ چھبیس سال کے عرصہ میں، ہمیں ایک عید بھی ایسی دیکھنی نصیب نہ ہوئی جسے "عیدِ آزاداں" تو ایک طرف، اپنے دورِ غلامی کی "عیدِ محکوماں" بھی کہا جا سکے۔ اسکے برعکس ہر سال عید کا چاند ہمارے لئے سالِ گزشتہ سے بھی بڑھ کر پیغامِ حزن و ملال لایا اور اب ۱۹۷۳ء سے تو کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے۔

"عیدِ آزاداں" اور "عیدِ محکوماں" کا تقابل تو اقبالؒ نے کیا تھا۔ لیکن (میرا خیال ہے کہ) ہمارے جیسی عیدِ سوگواراں و ماتم گساراں کا تصور اسکے افقِ خیال میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ اچھا ہوا وہ اس سے پہلے یہاں سے چلا گیا۔ وہ بھی اور قائدِ اعظمؒ بھی۔ شاید ان کے حسنِ نیت اور صدق و خلوص کا یہی صلہ مناسب خیال کیا گیا ہو!

ساری دنیا تاریکی میں

لیکن اگر ہم اہلِ پاکستان شبِ زندگی کی ہولناک تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں، تو اسکی سحرِ تاباں کی نمود اور کہیں بھی تو کہیں نہیں۔ اس وقت ہم تاریخ کے اُس دور سے گزر رہے ہیں جس میں ساری نوعِ انسان انتہائی درد و کرب میں مبتلا ہے۔ ہم طبیعی بربادیوں اور قلبی اضطرابیوں، دونوں کا شکار ہیں لیکن جو قومیں طبیعی طور پر کامیاب و کامران ہیں قلبی طور پر وہ بھی جہنم کے اس عذاب میں مبتلا ہیں جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ ؕ - (۱۰۴/۶-۷)۔ خدا (کے قانونِ مکافات) کی جلائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں، اگر بڑی بڑی قوموں سے خائف ہیں تو بڑی بڑی قومیں ایک دوسرے سے لرزاں و ترساں ہیں۔ جنگل کے ہرن اگر بھیڑیوں سے ڈر رہے ہیں تو بھیڑیئے ایک دوسرے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ اطمینان نہ انہیں میسر ہے نہ انہیں نصیب۔

ہم جن قوموں کے ہاں اپنے دکھوں کا مداوا مانگنے جاتے ہیں، ان کے زخموں پر سے حریری پٹیاں ہٹا کر دیکھئے تو وہ کچھ کم رستے ہوئے ناسور دکھائی نہیں دینگے۔ غالب کے الفاظ میں:

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۔ وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

لیکن ہماری جگر سوزی اس لحاظ سے ان سے زیادہ کرب انگیز ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و خوار بہت ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن قوموں کے سامنے بھی ذلیل و خوار، جو دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار شمار ہوتی تھیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ ہم اپنے آپ کو خود اپنی نگاہوں میں بھی ذلیل محسوس کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ وہ ذلت ہے جسے قرآن نے شدید ترین عذاب قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۔ ان پر ذلت چھا جائے گی۔ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۔ (۱۰/۲۷) ایسی ذلت جیسے کسی نے ان کے چہرے پر سیاہ راتوں کی کالک مل دی ہو۔ یہ ہیں ہمارے وہ چہرے جن کے ساتھ ہم اس عید کا استقبال کرنے کیلئے نکلے ہیں!

نامساعد حالات کی ان اندوہناکیوں کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ اس وقت پاکستان کا ہر مسلمان اس ملک اور اپنے مستقبل کے متعلق ہراساں نظر آتا ہے۔ جب یہاں کے عام باشندوں کی یہ حالت ہے تو آپ میرے جیسے انسان کی قلبی کیفیات کا اندازہ لگائیے کہ جس نے گزشتہ تیس چالیس سال سے اس پودے کو خونِ جگر کے ایک ایک قطرے سے سینچا ہو اور وہ اپنی عمر کے آخری دور میں اسکا یہ انجام دیکھ رہا ہو۔ پھر میرے لئے، عزیزانِ من! یہ سوال ایک ملک یا ایک مملکت کے عروج و زوال کا نہیں۔ میرے نزدیک تو یہ ملک اور اس میں آزاد مملکت ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھے (اور ہے)۔ اور وہ بلند مقصد تھا دین کا احیاء، یعنی ابتداءً ایک مختصر سے خطۂ زمین ہی میں سہی، صدیوں کے بعد قرآنی نظام کا قیام۔ لہٰذا، میرے لئے اس مملکت میں انتشار اور اسکا ضعف، یوں سمجھئے کہ دین و دنیا دونوں کے خسارہ کا موجب ہے۔ اس سے آپ میرے قلبِ حزیں کے کرب و الم کا تصور کر سکتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود، برادرانِ گرامی قدر! میں مایوس نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے الفاظ عام طور پر رسماً بول دیئے جاتے ہیں۔ یہ نہ کہنے والوں کے دل سے ابھرتے ہیں، نہ سننے والوں کے قلب کی گہرائیوں میں اترتے ہیں۔ لیکن میں تو ان الفاظ کو کسی پبلک پلیٹ فارم سے نشر نہیں کر رہا۔ میں انہیں بارگاہِ قرآنی میں کھڑا، خدا کی اس کتابِ عظیم کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں کہ

قرآن کا طالب العلم مایوس نہیں ہو سکتا

جہاں ایک ایک لفظ میزانِ عدل میں تولا جاتا اور کہنے والوں کی ذمہ داریوں کو پرکھا جاتا ہے۔ اس لئے مجھ میں اور اُن حضرات میں بنیادی فرق ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے ۔ عشق کے دردمند کا، طرزِ کلام اور ہے

میں قرآنِ حکیم کا طالب العلم ہوں۔ اور جس کی نگاہوں کے سامنے قرآن کھلا ہو، وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ مجھے اسکا بھی احساس ہے کہ اس مقام پر جھٹ سے کہہ دیا جائے گا کہ قرآن کے متعلق بھی اس قسم کی باتیں محض بربنائے عقیدت کہہ دی جاتی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن عقیدت اور عقیدت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک عقیدت اندھی تقلید پر مبنی ہوتی ہے، اور ایک عقیدت، غور و فکر، علم و بصیرت۔ اور دلائل و براہین کا اطمینان بخش نتیجہ، میری

زندگی کا پہلا تہائی حصہ اندھی عقیدت کا تھا۔ اس زمانے میں، میں بھی اس قسم کی باتیں محض تقلیداً کہا کرتا تھا۔ اسکے بعد میری زندگی کا تنقیدی دور آیا جسمیں اندھی عقیدت کا تراشیدہ ایک ایک بُت پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ یہ لا کا دور تھا جسمیں ہر اُس عقیدے کی نفی ہوتی چلی گئی جسے بلا سوچے سمجھے اختیار کر رکھا تھا۔ اور اس کے بعد میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا جسمیں، میں نے جس عقیدہ کو مانا، علیٰ وجہ البصیرت مانا۔ اسطرح میں یوں کہیئے، کہ قرآن عظیم کی صداقتوں پہ از سرِ نو ایمان لایا۔ لہٰذا اب میں اگر قرآن کے متعلق کچھ کہتا ہوں تو وُہ اندھی عقیدت پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ اس یقین پہ مبنی ہوتا ہے جو علم و بصیرت کا پیدا کردہ ہے۔ اور یہی ہے وُہ یقین جس کی بنا پر میں پکار کر کہتا ہوں کہ جس کے سامنے قرآن کھلا ہو، وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ انسان پہ مایوسی کس وقت طاری ہوتی ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ کسی لق و دق صحرا میں سفر کر رہے ہیں، اسطرح کہ نہ کوئی رفیق ساتھ ہو، نہ زادِ راہ۔ راستہ بیحد دشوار گذار ہو اور منزل بڑی کٹھن۔ یہ تمام حالات ایسے ہیں جن میں مسافر پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ جس راستے پر

انسان مایوس کب ہوتا ہے

آپ جا رہے ہوں، اسکے صحیح ہونے پہ آپ کو یقین ہو، تو آپ ان صعوبات سفر کے باوجود مایوس نہیں ہونگے۔ اس کے برعکس اگر کیفیت یہ ہو کہ اس صحرا میں آپ راستہ کھو جائیں۔ نہ کوئی نشانِ منزل آپ کے سامنے ہو اور نہ ہی کوئی بتلانے والا۔ تو آپ راستے کی ناکام تلاش کے بعد جب تھک کر بیٹھ جائیں گے تو اس وقت آپ پر مایوسی طاری ہو جائے گی۔

لہٰذا انسان مایوسی کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب اسے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے ان چار مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے جب کہا کہ وَ مَنۡ یَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَۃِ رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ (۱۵/۵۶) خدا کی رحمت سے صرف وُہ لوگ نا اُمید ہوتے ہیں جنہوں نے راستہ کھو دیا ہو۔ یہاں اس حقیقت کو ایک اصولی نکتہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ دیگر مقامات پر اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اگر صورت یہ ہو کہ ایک رہ نورد، اپنا راستہ بھول گیا ہو۔ کوئی راہ نما اسے نشاناتِ راہ کا پتہ نشان بتادے، وُہ نشانات اس کے سامنے بھی آ جائیں لیکن وہ انہیں صحیح ماننے سے انکار کر دے۔ تو ظاہر ہے کہ وُہ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بدستور مایوسیوں کا شکار رہے گا۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ لِقَآئِہٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ (۲۹/۲۳)۔ جو لوگ خدا کے متعین کردہ نشاناتِ راہ کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اور یوں اس تک پہنچنا ہی نہ چاہیں، وُہ بھی خدا کی رحمت سے مایوس رہتے ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ سفرِ زندگی میں یہ صورت نہیں کہ انسان کو دشت نوردی اور بادیہ پیمائی کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا ہو اور اسے منزل تک پہنچانے والے راستے کا پتہ نشان ہی نہ بتایا گیا ہو۔ قطعاً نہیں۔ یہ تو خدا کے خدا ہونے کے منافی ہے۔ دیکھئے اس نے کس حتم و یقین سے کہا ہے کہ کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ۔ (۶/۱۲ نیز ۶/۵۴)۔ اس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔

ان آیات میں آپ دیکھئے۔ قرآن کریم نے کہا کہ خدا نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے

رحمت کیا ہے

اور رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ رحمت کیا ہے جسے خدا نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے اور اس سے مایوسی کفر ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس سے انکار کا نتیجہ ضلالت ہے یعنی اس سے سفرِ حیات میں راستے گم ہو جاتے ہیں اور راستہ گم ہو جانے سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب خود خدا نے یہ کہہ کے دیا ہے کہ یہ رحمت خود قرآن مجید ہے۔ متعدد آیات میں قرآن کو رحمۃ کہا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷/۵۲) ہم نے ان کی طرف ایک کتاب بھیجی ہے جسے علم کی روشنی میں واضح کر دیا ہے۔ جو لوگ اسکی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، وہ ان کی راہ نمائی صحیح منزل کیطرف کر دیتی ہے۔ اور اسی جہت سے وہ رحمت ہے۔ دوسری جگہ اسے هُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى (۱۶/۸۹) کہا گیا ہے۔ یعنی صحیح منزل کی طرف راہ نمائی کرنے والی۔ راہرو راہِ حیات کو خوش خبریاں دینے والی کہ ہر قدم پہ منزل اس سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور اسطرح اس کے لئے آیۂ رحمت بننے والی۔ آپ نے کبھی اس نکتہ پر بھی غور فرمایا ہے جو قرآن میں آیا ہے کہ۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۵۵/۱-۲) قرآن کی تعلیم خدائے رحمٰن نے دی ہے۔ اس میں خدا کی صفت رحمانیت کو ابھار کر اسی لئے سامنے لایا گیا ہے کہ قرآن کو رحمت قرار دیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رحمۃ کو رحمٰن ہی عام کر سکتا تھا؟

قرآن کا مقام

پھر جسطرح قرآن کی تعلیم خود خدائے رحمٰن نے دی، اسی طرح یہ بھی خدا ہی نے بتایا کہ قرآن کا مقام کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات بھی خدا ہی بتا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ اُسی کی کتاب ہے اور جیسا کہ کہا گیا ہے "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" اس کتاب کا تعارف خدا سے بہتر کون کرا سکتا تھا ــــ اور پھر کتاب بھی ایسی جس کے متعلق (گویا) اس نے خود کہہ دیا ہو۔ کہ تیر الشید و دست از قلم کشید خدا ــــ نوعِ انسان کے لئے مکمل، غیر متبدل اور آخری ضابطۂ ہدایت کے معنی ہی یہ ہیں۔ کہ جہاں تک عالمِ انسانیت کا تعلق ہے اس کے بعد خدا نے "کوئی اور کتاب رقم نہیں فرمائی" (جیسا کہ میں نے اس سے بہت پہلے ایک درس میں کہا تھا) قرآن کے مقام کے تعارف کے لئے خدا نے کہا ہے کہ تم غور کرو کہ یہ کارگہِ کائنات بغیر کسی خلل اور فساد کے کس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے چلا جا رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ کائنات کی ہر شے اس قانون کی پابند ہے جو اس کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ وہ قوانین کتابِ فطرت میں منقوش ہیں۔ اور اسی قسم کے قوانین جو انسانوں کے لئے متعین کئے گئے ہیں، اس کتابِ مبین میں درج ہیں۔ اس لئے وہ اس کتاب کی عظمت و رفعت کو سامنے لانے کے لئے، خارجی کائنات کے مظاہر کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ واقعہ میں ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ۔ ان سے کہو کہ نہیں! بات یہ نہیں کہ میں ان بسیط حقائق کو یونہی نظری طور پر بیان کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں انہیں کائنات کے محسوس نظام کی مرئی مثالوں سے سمجھاؤں گا۔ اس ضمن میں، میں سب سے پہلے ستاروں کی گذرگاہوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ" - اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کتنی عظیم شہادت ہے (۵۶/۷۵-۷۶)

میں ستاروں کی گذرگاہوں ـــ ان کے طلوع و غروب کے مواقع ـــ کو اس حقیقت کبریٰ کی تثبیت کیلئے بطور شہادت پیش کرتا ہوں کہ

اِنَّہٗ لَقُرْآنٌ کَرِیْمٌ (۵۶/۷۷)

یہ قرآن بڑے شرف و مجد کا حامل اور نوع انسان کیلئے بیحد نفع رساں اور عزت بخش ہے۔ خود واجب التکریم اور جو اسے راہ نما بنالے، اسے واجب التکریم بنا دینے کا ضامن اور کفیل۔

سورۂ تکویر میں اس اجمال کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْکُنَّسِ۔ نہیں! میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں بھی جو ایک برق پا غزال کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر چھپ جاتے ہیں۔ وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ اور شہادت میں پیش کرتا ہوں رات کو جب وہ نہایت آہستہ سے دبے پاؤں آتی ہے۔ اور اسی طرح خاموشی سے دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے۔ اور صبح کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے ساری دنیا کو حیات نو کا پیام دینے کیلئے مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔

میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کبریٰ کی تبیین کے لئے کہ

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ۔ (۸۱/۱۹)

جس شخص کی زبان سے تم اس قرآن کو سن رہے ہو وہ ہمارا بھیجا ہوا قاصد ہے اور نہایت معزز اور واجب التکریم قاصد۔ یعنی یہ پیغام (قرآن) بھی اَلْکَرِیْم (۵۶/۷۷) اور اس کا لانے والا بھی اَلْکَرِیْم (۸۱/۱۹) اور جس (خدا) نے اسے بھیجا ہے وہ بھی اَلْکَرِیْم (۸۲/۶) سورہ الطارق میں ہے۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ۔ یہ فضائی

ارض و سما کی شہادت

کرّے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حسن و خوبی سے اپنے اپنے افلاک میں تیرتے پھرتے ہیں (۳۶/۴۰) اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں۔ وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اور یہ زمین، جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے۔ (وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ) یہ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ۔

قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (DECISIVE) ہے۔ وَمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ (۸۶/۱۴) یہ کوئی مذاق نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ محض "شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی" (اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ۔ (۵۲/۳۰) یہ غلط ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ۔ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ وہ تمام حقائق جو تمہاری نگاہوں کے سامنے آچکے ہیں اور جو تمہاری نگاہوں سے مستور ہیں وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ۔ وَّمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ (۶۹/۳۸-۴۱) یہ (قرآن) ایک واجب التکریم پیغمبر کی وساطت سے پہنچنے والے ابدی حقائق کا مجموعہ ہے محض شاعرانہ تخیلات کا نگاہ فریب مرقع نہیں۔ وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ۔ (۶۹/۴۲) نہ ہی یہ کسی اٹکل پچو باتیں بتانے والے نجومی کی قیاس آرائیاں ہیں۔ بلکہ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۶۹/۴۳) یہ اس خدا کی طرف سے نازل کردہ قوانین کا ضابطہ ہے جو تمام کائنات کا نشوونما دینے

والا ہے۔ ہر شے کو آہستہ آہستہ، بتدریج اس کے نقطۂ آغاز سے، معراجِ تکمیل تک پہنچانے والا۔ اس قسم کے حقائق نہ کوئی شاعر دے سکتا ہے نہ سرپھرا دیوانہ۔ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۝ بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ ( ) یہ وہی دے سکتا ہے جو خدا کی طرف سے، تعمیری نتائج پیدا کرنے والی مثبت حقیقت لایا ہو۔ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ نہ ہی شاعری اسے زیب دیتی ہے۔ جو زندگی بخش، حیات آور، پیغامِ انقلاب کا حامل ہو، اُسے شاعری سے کیا واسطہ؟ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ۔ یہ ان ابدی حقیقتوں کی یاددہانی ہے۔ جنہیں تم نے فراموش کر رکھا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنی بات کو نہایت ابھرے اور نکھرے ہوئے انداز سے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ( ) تاکہ ہر اس شخص کو جس میں زندگی کی رمق باقی ہے، غلط روش پر چلنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کر دے، اور جو لوگ اس کے باوجود اسی (غلط) روش پر چلتے جائیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کس طرح حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ ( ) یہ فیصلہ کن بات کرتا ہے۔ یونہی مذاق نہیں کرتا۔ چونکہ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کی عظمت اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ۔ ( ) اگر (مثال کے طور پر) ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے اور اسے احساس عطا کر دیتے تو، تو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے ہلاکت آفریں نتائج کے احساس سے اس کی سختی کس طرح نرم پڑ جاتی اور کس طرح اس کا جگر شق ہو جاتا۔ اس لئے کہ إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ فَصْلٌ کے معنی ہوتے ہیں الگ کر دینا۔ متمیز کر دینا۔ حق کو باطل سے جدا کر کے دکھا دینا۔ غلط کو صحیح سے الگ کر کے بتا دینا۔ اسی کے لئے دوسری جگہ کہا۔ حٰمٓ ۝ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ۔ یہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین ہے جو خود بھی واضح اور صاف ہے۔ اور جو ہر بات کو نہایت وضاحت اور صراحت سے ابھار کر اور نکھار کر بیان کر دیتا ہے۔ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ۔ ہم نے اس کا آغازِ نزول (رمضان کے مہینے کی ایک) ایسی شب میں کیا جو تمام نوعِ انسانی کیلئے نہایت برکت و سعادت کا موجب بن گئی۔ یہ کتاب ہمارے اس قانون (سنت اللہ) کے مطابق نازل ہوئی جس کی رو سے ہم شروع سے انسان کو اس کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ۔ ( ) اس میں، ان تمام امور کو جو حکمت پر مبنی ہیں، (غلط امور سے) الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ کتاب جس کا تعارف خود صاحبِ کتاب (خدائے حکیم) نے اس انداز سے کرایا ہے۔ میں نے

قرآن خود روشنی ہے

پہلے کہا ہے کہ قرآن رحمت اس لئے ہے کہ یہ وہ نور ہے جو دشتِ حیات کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف کرتا ہے۔ اس راہ نمائی کے متعلق بھی قرآن کریم نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے، لیکن میں یہاں (بغرضِ اختصار) سورہ مائدہ کی دو آیات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ان میں کہا

گیا ہے کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ - خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور، ایک روشنی آگئی۔ یعنی ایک ایسی کتاب جو بالکل واضح ہے۔ ظاہر ہے کہ روشنی اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنے یا دیکھنے کیلئے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کمرے میں بجلی کا قمقمہ روشن ہو تو آپ وہاں دیا جلا کر نہیں لے جاتے کہ دیکھیں بجلی کا قمقمہ کہاں ہے اور کیسا ہے! یہ مفہوم ہے ایسا کہنے کا کہ روشنی اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے البتہ انسانی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ روشنی اُسے ہی فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ جو آنکھیں بند رکھے، اس کے لئے روشنی کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ قرآن کے سراجِ منیر سے مستفید ہونے کیلئے انسانی عقل وفکر کی آنکھ کا کھُلا رہنا ضروری ہے۔ جو لوگ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے، انہیں یہ جگمگاتا چراغ کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

یہ ہے وہ مشعل، وہ سراجِ منیر، وہ جگمگاتا چراغ جو سفرِ زندگی میں راہ نمائی کا کام دیتا ہے۔ یہ چراغ کرتا کیا ہے؟ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ - (۵/۱۶) "یہ سلامتی کے راستوں کیطرف راہ نمائی کرتا ہے"۔ سلام، بڑا جامع لفظ ہے۔ عام طور پر یہ لفظ "خطرات سے محفوظ رہنے" کیلئے بولا جاتا ہے۔ لیکن اسکا مفہوم اتنا ہی نہیں۔ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا مفہوم ہوتا ہے کسی کو خطرات سے محفوظ رکھ کر اسے تکمیل کی منزل تک پہنچا دینا۔ یہ کاروانِ انسانیت کی خطرات سے حفاظت کسطرح کرتا ہے؟ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ـــــ یہ انہیں، زندگی کی ہولناک تاریکیوں سے نکال کر، روشنی کیطرف لے آتا ہے اور اسطرح يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵/۱۶) ان کی راہنمائی زندگی کے سیدھے، توازن بدوش راستے کیطرف کر دیتا ہے۔ یہاں صراطِ مستقیم کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ - (۱۷/۹) یقیناً یہ قرآن، نوعِ انسان کی راہ نمائی اس راستے کیطرف کرتا ہے جو اقوم ہے ـــــ سب سے زیادہ متوازن راہ۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ زندگی کے قیام کا دارومدار توازن پہ ہے۔ جس کا توازن بگڑ جائے، چلنا تو ایک طرف، وہ اپنے پاؤں پہ کھڑا بھی نہیں رہ سکتا ـــــ ہماری زبوں حالی اور حرماں نصیبی کی بنیادی وجہ یہی ہے ناں کہ ہمارے معاشرہ کا توازن بگڑ چکا ہے۔ نہ ہماری انفرادی زندگی متوازن (BALANCED) رہی ہے نہ معاشرہ متوازن۔ قرآن، افراد اور اقوام، بلکہ نوعِ انسانی کا بگڑا ہوا توازن درست کر دیتا اور اسطرح انہیں چلنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس مقام پر ضمناً اتنا اور سمجھ لیجئے کہ قرآن صحیح راستے کیطرف راہ نمائی کرتا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ کسی کو اٹھا کر خود منزل تک نہیں پہنچا دیتا۔ منزل تک پہنچنے کے لئے چلنا مسافر کو خود ہی پڑتا ہے۔ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کی شرط سے یہی مراد ہے۔ ایمان ہوتا ہے راستے کے صحیح ہونے پر یقینِ محکم اور عملِ صالح کے معنی ہوتے ہیں اس راستے پر چلتے جانا۔ جو مسافر راستے کی صحت پر یقین کے دعوے کے باوجود، بیٹھا رہتا ہے، چلتا نہیں، راستے کی صحت اسے بھی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن زندگی کی راہوں کو روشن کر دیتا ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے راہزن ہیں جو اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کاروانِ انسانیت کو غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس سوال اور اس کے جواب کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم صحیح راستے کی طرف قدم ہی نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لئے، یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے، اور یہ راہزن اسکی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ ایک لفظ میں یوں سمجھئے کہ قرآن انسانوں پر دوسرے انسانوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیتا ہے ۔۔۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، قرآن

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے ۔ نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

انسانوں پر دوسرے انسانوں کا اقتدار، سیاسی اجارہ داریوں کی رُو سے بھی قائم ہوتا ہے ۔۔۔ جسے ملوکیت کہتے ہیں اور معاشی خون آشامیوں کے ذریعہ بھی ۔۔۔ جسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن سیاسی یا معاشی اقتدار، برہنہ ہوتا ہے اس لئے اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں، اقتدار کی ایک اور شکل ہے جو نقاب پوش رہتی ہے اس لئے اپنی

رہزنِ ایمان و آگہی

فریب دہی میں بڑی کامیاب ہوتی ہے۔ یہ اقتدار ہے مذہبی پیشوائیت کا ۔۔۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو سچ کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے۔

نوعِ انسانی کی پوری تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جس قوم میں بھی مذہبی پیشوائیت کا غلبہ رہا، زندگی کی تاریک راہیں اس پر کبھی روشن نہ ہو سکیں۔ یہ گروہ خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کاروانِ انسانیت کے عقل و فکر کے چراغ گل کر دیتا ہے۔ اسطرح اس تیرہ بخت قافلے کے لئے تاریکیوں میں ٹکریں مارنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ قرآن ان کاروانوں کو وارننگ دیتا ہے کہ یاد رکھو ۔۔۔ اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ‏ (۹/۳۴)۔ ہادیانِ شریعت ہوں یا مرشدانِ طریقت، یہ لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھاتے رہتے ہیں اور خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔۔۔ آپ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ سلسلۂ رشد و ہدایت کی اوّلیں کڑی۔ حضرت نوحؑ سے لیکر اسکی آخری کڑی ۔ حضور نبی اکرمؐ تک ، ہر رسول نے ایک ہی پیغام دیا اور وہ یہ کہ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۔ مَا لَكُم مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ ‏ (۷/۵۹) لوگو! صرف ایک خدا (کے قوانین) کی اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا کسی کو حقِ اقتدار حاصل نہیں۔ یہ پیغام جیسا کہ ظاہر ہے، ہر مدعیٔ اقتدار کے لئے پیغامِ موت تھا۔ اس لئے ان کی طرف سے اس کی مخالفت لازمی تھی۔ لیکن ملوکیت یا سرمایہ پرستی ۔۔۔ جنہیں ہم نے برہنہ اقتدار کہہ کر پکارا ہے ۔۔۔ اس مخالفت میں براہ راست سامنے آنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے، ان پیغامبرانِ انقلاب کی مخالفت کے لئے، ہمیشہ اس گروہ، مذہبی پیشوائیت، کو آگے بڑھایا جو خدا کے نام

مذہبی پیشوائیت

پر لوگوں کو دھوکا دیتا تھا۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ فرعون نے، حضرت موسیٰؑ سے

آغازِ سخن تو خود کیا لیکن جلد ہی بھانپ لیا کہ اس طرح کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد اس نے اُن کے مقابلہ کے لئے ہامان اور اس کے جنود (لشکروں) کو بلایا۔ بس یہ ہے ملخص اس ساری داستانِ تزاحم و تصادم کا۔ اس گروہ کی ٹیکنیک بڑی سادہ و پُرکار ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کے لئے کسی ایسے راستے کو تجویز نہیں کرتے جسے کھلے بندوں کفر و الحاد اور لادینی و خدا فراموشی کا راستہ کہا جا سکے۔ اس طرح تو کوئی بھی ان کے دام فریب میں نہیں پھنس سکتا۔ یہ انہیں کسی الگ راستے پر نہیں لے چلتے۔ یہ ان کے ساتھ اُسی راستے پر چلتے ہیں لیکن تھوڑی دُور آگے جا کر اسے ذرا ٹیڑھا کر دیتے ہیں ——— اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (۱۱/۱۹) یہ لوگ خدا کا راستہ اسطرح روکتے ہیں کہ اسے ذرا ٹیڑھا کر دیتے ہیں۔ سادہ لوح مسافروں کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ وہ کسی دوسرے راستے پر ڈال دیئے گئے ہیں۔ وہ اُسی حسنِ نیت، خلوص و صداقت، اور جوش و خروش کے ساتھ اس راستے پر گامزن رہتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان کا ہر قدم انہیں منزل سے دُور کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی سحر انگیز افسانہ طرازیوں اور خواب آور قصہ گوئیوں سے غلط راستے کو نہایت پُرکشش اور جاذبِ نگاہ بناتے رہتے ہیں اور عوام بیچارے ہپناٹسٹ کے "معمول" کی طرح آنکھیں بند کئے ان کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اسطرح ان میں یہ دیکھنے اور سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رہتی کہ ان کی منزل کونسی تھی اور وہ چل کس راستے پر رہے ہیں نتیجہ یہ کہ اسقدر پُرمشقت سفر کے بعد ان کے حصے میں منزل سے دُوری اور تکان کے سوا کچھ نہیں آتا۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن ساری کوششیں دنیا میں رائیگاں جاتی ہیں لیکن وہ اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا۔ (۱۸/۱۰۳-۱۰۵) ان کا کیا کرایا سب بے نتیجہ رہ جاتا ہے ——— ایسا بے نتیجہ کہ اسے مکافاتِ عمل کے میزان میں رکھ کر تولنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ سوچئے عزیزانِ من! کہ ہماری بے چاری مفلس اور نادار قوم، مذہب کے نام پر جس قدر صعوبات برداشت کرتی اور وقت، توانائی اور پیسہ صرف کرتی ہے، اس کا کچھ بھی نتیجہ مرتب ہوتا ہے؟ یہ ہے جو مذہبی پیشوائیت قوموں کے ساتھ کرتی ہے؟

اس کے لئے ان کی ٹیکنیک قابلِ غور ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو "عاصی پُر معاصی" اور "ہیچ مداں و ہیچ میرز" کہتا رہتا ہے۔ کوئی معاملہ ان کے ہاں لے جایئے، یہ اُس کے متعلق اپنی طرف سے کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف اسلاف کے اقوال کو بطور سند اور حجت پیش کر دیں گے۔ ان کی ساری زندگی اسی طرح گزرے گی لیکن ان میں سے جونہی کوئی آنکھیں بند کر لے گا، اس کا شمار سلف صالحین میں ہو جائے گا۔ اب وہ "عاصی پُر معاصی" نہیں رہے گا۔ تقدس کا ہالہ اُس کے چہرے کے گرد بُنا جائے گا۔ صلوٰۃ و سلام سے اس کا نام لیا جائے گا، اور دینی مسائل کے حق میں اس کے پاس کوئی علمی دلیل نہ تھی، اس کے اقوال۔ ان کی تائید کے لئے بطور سند و حجت پیش کئے جائیں گے۔ مسلسل پراپیگنڈے سے، انہیں عوام کی نگاہوں میں اس قدر مقدس بنا دیا جائیگا کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کریں گے۔

اسطرح "سلف صالحین کی تقدیس" کے پردے میں، مذہبی پیشوائیت، اپنے اقتدار کی مسندیں محکم تر کرتی چلی جائیگی۔ اس کے بعد ان کا کام بڑا آسان ہو جائے گا۔ جونہی کسی نے عوام سے کہا کہ یہ لوگ تمہیں غلط راستے پر لئے جا رہے ہیں، انہوں نے وہاں مچا دی کہ یہ ملحد و بے دین، تمہیں اسلاف کے راستے سے بہکا کر کسی اور طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس سے عوام میں اشتعال پیدا کرکے، یا تو اس کا گلا گھونٹ دیا جائیگا اور یا اس کی آواز کو شور و غوغا کے اس طوفان میں غرق کر دیا جائیگا۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ جب بھی کسی قوم میں، کوئی رسول آیا اور اس نے ان سے کہا کہ اُعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔ (۷/۵۹) اطاعت صرف قوانین خداوندی کی کرو۔ اس کے سوا کسی کو حقِ اقتدار حاصل نہیں۔ تو مذہبی پیشوا اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے اور انہوں نے یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا کہ مَا ھٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّکُمْ عَمَّا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُکُمْ (۳۴/۴۳) اس شخص کی باتوں میں نہ آ جانا۔ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے اسلاف کے راستے سے بہکا دے۔ (جیسا کہ معلوم ہے) قرآن کریم نے آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت کی داستان کا آغاز حضرت نوحؑ سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب حضرت نوحؑ نے خدا کا پیغام قوم کے سامنے پیش کیا تو مذہبی پیشوا اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ مَا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ۔ (۲۳/۲۴) "ہم نے اپنے اسلاف سے ایسی کوئی بات نہیں سنی" اس لئے ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ حضرت نوحؑ کے بعد، حضرت صالحؑ آئے تو پیغامِ خداوندی کے جواب میں ان سے بھی یہی کہا گیا کہ اَتَنْھٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا۔ (۱۱/۶۲) اچھا! تو اس لئے آیا ہے کہ ہم سے ان معبودوں کو چھڑا دے جن کی پرستش ہمارے اسلاف کیا کرتے تھے۔ ہم تمہاری بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ مٹی کی مورتیاں جن کے سامنے تم اسطرح جھکے بیٹھے ہو، ذرا بتاؤ تو سہی کہ ان کے معبود ہونے کی تمہارے پاس دلیل کیا ہے، تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اس کی، اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَھَا عٰبِدِیْنَ۔ (۲۱/۵۳) ہمارے اسلاف ان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اور جب حضرت ابراہیمؑ نے ان کی اس دلیل کے بودے پن کو واشگاف کیا تو انہوں نے شور مچا دیا اور

ہر رسول کی مخالفت

قوم سے کہا کہ اسے پکڑو، مارو، جلا دو، یہ تمہارے اسلاف کے حق میں گستاخی کرتا ہے۔ اسی طرح جب مدین میں حضرت شعیبؑ نے اقتدارِ خداوندی کی دعوت پیش کی تو انہیں بھی، اس کا یہی جواب ملا کہ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ۔ (۱۱/۸۷) اے شعیب! تمہاری اس دعوت کا تو مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کا راستہ چھوڑ دیں۔ آسمانی دعوتِ انقلاب کے ردِّ عمل کے طور پر اسی قسم کا جواب حضرت موسیٰؑ کو ملا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸) کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔ اور جب اسی سلسلہ ہدایت کی آخری کڑی حضور ختمی مرتبتؐ کی طرف سے وہی دعوت پیش کی گئی تو اس کا جواب بھی یہی ملا کہ مَا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِی الْمِلَّۃِ الْاٰخِرَۃِ۔ (۳۸/۷) جو کچھ تم کہتے ہو، ہم نے اپنے اسلاف سے ایسا نہیں سنا اس لئے ہم اس دعوت کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ حضرت نوحؑ

ہوں یا ہودؑ، حضرت صالحؑ ہوں یا شعیبؑ، حضرت موسٰیؑ ہوں یا حضور نبی آخر الزمانؐ، جب، جہاں اور جس نے بھی خالص وحی خداوندی کی اطاعت کی دعوت دی، اسے یہی جواب ملا کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ - (۴۳/۲۳) ہم تمہاری بات نہیں سنیں گے۔ ہم اپنے اسلاف کے طریقے پر چلتے جائیں گے۔ کہا گیا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵/۱۰۴)، اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے اسلاف کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں۔ تو کیا پھر بھی تم انہی کا اتباع کرو گے۔ جواب ملا کہ آپ اپنی دعوت کو سنبھال رکھیئے۔ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا - (۵/۱۰۴) ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے راستے پر چلتے رہیں۔

قرآن کریم نے اس ساری تفصیل کو ایک آیت میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ جب کہا کہ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ - (۴۳/۲۳) اسی طرح ہم نے جب بھی کسی بستی میں کوئی نذیر بھیجا تو اس گروہ نے جو دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی گذارتا تھا۔ یہ کہہ کر اسکی مخالفت کی کہ ہم کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم نہیں جانتے کہ دلیل کیا ہوتی ہے اور برہان کیا۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ اسلاف کی راہ ہی سلامتی کی راہ ہوتی ہے۔ ہم اس پر چل رہے ہیں اور اسی پر چلتے جائیں گے۔ اس لئے ہم تمہاری بات سننے کے لئے تیار نہیں۔

سلسلہ انبیاء کرامؑ تو حضورؐ کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا، لیکن دعوتِ انبیاء کرامؑ کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ یہ دعوت اپنی مکمل اور غیر متبدل شکل میں قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ اسے پیش کرنے کے لئے خدا کی طرف سے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فریضہ امتِ محمدیہ کے سپرد کر دیا گیا جب کہا کہ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا - (۳۵/۳۲) پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنا دیا جنہیں اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اب خالصتًہ اطاعت خداوندی کی دعوت کا فریضہ امتِ محمدیہ کو سونپ دیا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب وہ دعوت موجود رہے گی تو اس کی مخالفت کرنے والی مذہبی پیشوائیت کی جماعت بھی موجود ہوگی، کیونکہ کشمکش حق و باطل ازل سے چلی آ رہی ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس تیرہ سو سال میں یہ دعوت کسطرح پیش کی گئی اور اسکی مخالفت کس کس انداز سے ہوئی، اس تفصیل سے صرفِ نظر کر کے مجھے دورِ حاضر کیطرف آ جانا چاہیئے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ مملکتِ پاکستان کے مطالبہ کا تقاضا، مقصود اور منتہٰی کیا تھا، تو میں ایک فقرہ میں کہہ دونگا کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین وجود میں آ جائے جہاں انسان، انسانوں کے اقتدار سے نجات حاصل کر کے، خالصتًہ قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کرنے کے قابل ہو سکے یعنی ایسی مملکت جسمیں حکومت صرف خدا کی کتاب کی ہو۔ پاکستان کا تصور دینے والے اقبالؒ نے اپنے عمر بھر کے فکر و تدبر کے بعد۔ اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ ہماری ذلتوں اور ناکامیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے خدا کی کتاب سے اعراض برت رکھا ہے۔ اسی لئے انہوں نے مسلمانوں سے

کہا تھا کہ:

خوار از مہجوری قرآن شدی شکوہ سنج گردش دوراں شدی

تم خواہ مخواہ زمانے کی گردشوں اور حالات کی ناسازگاریوں کا شکوہ کرتے پھر رہے ہو۔ تمہاری ذلت و خواری کا حقیقی سبب یہ ہے کہ تم نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔ لہٰذا

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اقبالؒ کے تتبع میں یہی آواز قائداعظم بھی بلند کرتے رہے۔ اقبالؒ، پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور قائداعظمؒ اس کے فوری بعد ہم سے جدا ہو گئے ہیں قرآن

میری قرآنی دعوت

کریم کا طالب العلم ہوں اس لئے یہ فریضہ میں نے اپنے ذمے لیا کہ اس دعوت کو عام کروں کہ اسلامی مملکت پاکستان میں اطاعت و محکومیت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔ اقتدار اسی کو حاصل ہو گا اور کسی کو نہیں۔ ادھر سے یہ دعوت پیش ہوئی اور جیسا کہ ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اسکی مخالفت کے لئے مذہبی پیشوائیت ہجوم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی، اس لئے کہ قرآنی حکومت میں ان کا اقتدار ختم ہو جاتا تھا۔ مملکت پاکستان کی چھبیس سالہ تاریخ اسی کشمکش کی عبرت آموز داستان ہے جیسا کہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے، مذہبی پیشوائیت نے کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی داعی الی الحق سے یہ کہا ہو کہ آؤ! ہم تمہاری بات کو علم و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر یہ معیار حق و صداقت پر پوری اتری تو اسے اختیار کر لیا جائے گا۔ اور اگر یہ صحیح ثابت نہ ہوئی تو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ علم و بصیرت کی بارگاہ سے کبھی ان کے حق میں فیصلہ نہیں ہو گا۔ انہوں نے ہمیشہ یہ طریق اختیار کیا ہے کہ اس داعی کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیوں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ جب حضور نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تو اس مقصد کے لئے انہوں نے جو حربے استعمال کئے، قرآن اسے تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ آپؐ کو مفتری کہا گیا۔ کذاب کہا گیا۔ پاگل (مجنوں) کہا گیا۔ مسحور کہا گیا۔ کاہن کہا گیا۔ شاعر کہا گیا۔ آپؐ کا ہر طرح سے مذاق اڑایا گیا۔ استہزا کیا گیا۔ غرضیکہ کوئی الزام ایسا نہیں تھا جسے حضورؐ کے خلاف تراشا نہ گیا ہو، اور کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جسے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ حضورؐ جس جگہ یہ آواز بلند کرتے، یہ لوگ ہجوم کر کے آ جاتے اور عوام سے کہتے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) تم اس قرآن کو نہ خود سنو، نہ دوسروں کو سننے دو۔ جہاں اسے پیش کیا جائے، خوب شور مچاؤ، تاکہ لوگ اسے سن ہی نہ سکیں۔ یہی ایک طریق ہے جس سے تم اس آواز کو دبا سکتے ہو۔ اگر لوگوں نے اسے سن لیا تو پھر یہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہے گی۔

میرے خلاف الزامات

عزیزان من! مجھے حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم سے کیا نسبت؟ لیکن چونکہ، سنت رسول اللہ کے اتباع میں، میں بھی وہی کہتا ہوں جسے حضورؐ پیش فرمایا کرتے تھے، یعنی اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) اتباع صرف کتاب خداوندی کا کرو۔ اس کے سوا کسی کا اتباع نہ کرو، خواہ

اُسے کتنا ہی بڑا بزرگ اور مقدس کیوں نہ بتایا جائے"۔ اس لئے اس دعوت کی مخالفت میں سب بھی وہی استعمال کئے گئے۔ یعنی الزام تراشیاں اور اشتعال انگیزیاں ــــ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ منکرِ ختمِ نبوت ہے۔ خود مدعی نبوت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ تین نمازیں اور ۹ دن کے روزے بتاتا ہے۔ کہتا ہے اُردو میں نماز پڑھا کرو۔ یہ اور اسی قسم کے اور سینکڑوں بے بنیاد الزامات۔ پھر اپنے متبعین سے تاکید۔ اس کے پاس کبھی نہ بیٹھو۔ اس کے درس میں کبھی نہ جاؤ۔ اس کی کتابوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ طلوعِ اسلام کو چھوڑ تک نہیں ورنہ تمہارا ایمان جاتا رہے گا۔ تم بھی اسی کی طرح گمراہ اور بے دین ہو جاؤ گے۔ یعنی وہی پیمانا حربہ کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ۔ (۲۶/۴۱) قرآن کی آواز مت سنو۔ خود بھی نہ سنو اور شور مچاتے رہو تاکہ دوسرے بھی اسے سننے نہ پائیں۔

یہاں آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب قرآن کے واضح احکام پیش کر دیئے جائیں تو یہ حضرات ان کی مخالفت کس دلیل کی رُو سے کرتے ہیں؟ اسی "دلیل" کی رُو سے

اسلاف پرستی کی مثالیں

جس سے دعوت الی اللہ کی مخالفت شروع سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یعنی مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ (۲۴/۲۳) "ہم نے اسلاف سے ایسا نہیں سنا"۔ عزیزانِ من! اگر وقت ہوتا تو میں اس کی کئی ایک مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا۔ لیکن سردست میں دو ایک پر اکتفا کروں گا۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ ان سے جنسی تمتع بھی کر سکتے ہیں اور اس کے بعد چاہیں تو انہیں فروخت بھی کر سکتے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ مسلک تو قرآن کریم کے احکام کے صریحاً خلاف ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا ملا؟ یہ کہ

> مؤلف (یعنی معترض) کی غلطی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۲۹۲)

یہ جواب کسی "ملائے مسجد" کا نہیں، ہمارے زمانے کے ایک بہت بڑے، ماڈرن مفسرِ قرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ہے۔ ان کے نزدیک صرف قرآن سے احکام اخذ کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اسی قسم کے تھے وہ لوگ جن کے متعلق قرآن بھیجنے والے نے کہا تھا کہ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱) کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف اس کتاب کو نازل کر دیا۔ اس کے جواب میں یہ حضرات خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہاں! یہ کتاب کافی نہیں۔ جو لوگ اسے کافی سمجھتے ہیں وہ "مخبوط الحواس" ہیں۔ ایسے ہی (قرآن کو ناکافی سمجھنے والے) وہ لوگ تھے جن کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (۳۹/۴۵) جب ان سے خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ کبیدہ خاطر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور جب اس کے علاوہ اوروں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے

تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ یہ اکابر کون ہیں جن کے ذکر سے یہ اس قدر خوش ہو جاتے ہیں؟ وہی اسلاف!

یا مثلاً ان کا مسلک یہ ہے کہ دادا کی میراث سے یتیم پوتا کو حصہ نہیں دیا جا سکتا۔ ان سے کہا گیا کہ یہ فیصلہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ سنئے کہ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے کیا فرمایا۔ کہا کہ:

> فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اسمیں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ مجھے ابھی تک قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا۔ جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتا ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت مارچ ۱۹۵۲ء)

یا مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ کہا گیا کہ یہ تو قرآن کریم کی صریح خلاف ورزی ہے۔ فرمایا کہ ہمارے ہاں مسلسل ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ خلافِ اسلام نہیں ہو سکتا۔ عرض کیا کہ اگر ایک بات قرآن کے خلاف ہے تو کیا وہ محض اس لئے صحیح قرار پا جائے گی کہ وہ ہمارے ہاں مسلسل چلی آ رہی ہے۔ غلطی، غلطی ہی ہوتی ہے خواہ اس پر کتنے ہی لمبے عرصے سے عمل کیوں نہ ہو رہا ہو۔ ارشاد ہوا:

> اگر ایسے امور بھی مشکوک ہو جائیں جن کے لئے اس قدر تسلسل اور تواتر کے ساتھ شہادتیں پائی جاتی ہیں تو معاملہ ایک دو مسائل تک محدود کہاں رہتا ہے اس کے بعد تو زمانہ گذشتہ کی کوئی چیز بھی جو ہم تک روایۃً پہنچی ہے۔ شک سے محفوظ نہیں رہتی۔
>
> (مرتد کی سزا - صہ)

یہ ہیں وہ "دلائل" جو قرآن کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں!

مذہبی پیشوائیت کے مسلک اسلاف پرستی کا سب سے پہلا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ——— اس سے قوم کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفقود ہی نہیں مسلوب ہو جاتی ہیں۔ اسے بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ کسی معاملہ کے متعلق ان سے پوچھیں۔ یہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس کے متعلق فلاں امام کا یہ قول ہے۔ فلاں محدث نے یہ کہا ہے۔ فلاں مفسر کا یہ ارشاد ہے۔ فلاں کتاب میں یہ آیا ہے یعنی اس میں ان کی اپنی عقل و فکر کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یہ اسلاف کے اقوال پیش کرتے چلے جائیں گے۔ ان میں سب سے بڑا عالم اسے کہا جائے گا جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے۔ یعنی جو بہت بڑا "کیٹالاگ" ہو۔ ظاہر ہے کہ اسے ذو علم کہہ سکتے ہیں نہ فکر۔ اسے زیادہ سے زیادہ کتابی معلومات کہہ سکتے ہیں۔ اب رہا مستفسر، سو

اسے اسکی قطعاً اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اسلاف کے ان ارشادات پر کسی قسم کی تنقید کر سکے۔ اسے انہیں بلاچون وچرا ماننا ہوگا۔ اگر اُس میں ذرا سا بھی تامّل کریگا تو اس پر کفر کا فتویٰ لگ جائیگا۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا اس قوم میں فکری صلاحیتوں کی ذرا سی بھی نمود ہو سکتی ہے؟ اور جب اس حالت پر صدیاں گذر جائیں تو ان میں سوچ بچار کا مادہ بھی باقی رہ سکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ ایسی قوم کے عوام اور ان کے متقداؤں کی مثال یوں سمجھو۔ اَلَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً۔ کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان کے پیچھے ایک چرواہا۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ، اور کچھ الفاظ یاد رکھے ہیں۔ بلا معنی و مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور الفاظ دھراتا رہتا ہے۔ اور بھیڑ بکریاں، جو ان آوازوں اور اشاروں کی عادی ہو چکی ہیں، بلا سوچے سمجھے، ان کے مطابق چلتی رہتی ہیں۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ - (۲/۱۷۱) بہرے، گونگے، اندھے، عقل و فکر سے عاری حیوان۔ انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے! آپ سوچئے کہ ایسی قومیں، ان قوموں کا مقابلہ کرنا تو ایک طرف، ان کے زمرے میں بھی شمار ہو سکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتیں اور علم و بصیرت کی روشنی میں قدم اٹھاتی ہیں؟ زندہ قوموں میں شمار ہونا تو ایک طرف، قرآن انہیں صفِ آدمیت میں بھی جگہ نہیں دیتا جب کہتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ - (۷/۱۷۹) یہ لوگ انسان نہیں، حیوانات کی مانند ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، کہ حیوانات عقل و فکر سے کام نہیں لیتے (کہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے) تو اپنی جبلی راہنمائی کا اتباع تو کرتے ہیں! وہ لاکھ چرواہے کی آوازوں پر چلیں۔ چرواہا اگر کسی بکری کو گوشت کھلانا چاہے تو وہ کبھی اس کا کہنا نہیں مانے گی۔ وہ اپنی فطری جبلت کا اتباع کرے گی جس نے اس کیلئے گوشت کو "حرام" قرار دے رکھا ہے۔ برعکس اسلاف پرست قوم کے کہ اس کے لئے حرام حلال کی فہرستیں بھی ان کے مذہبی پیشوا مرتب کرتے ہیں! خدا کی متعین فرمودہ فہرست کو یہ کافی نہیں سمجھتے۔

مذہبی پیشوائیت کے تسلط کا دوسرا، اور سب سے زیادہ خطرناک، اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم میں منافقت

منافقت عام ہو جاتی ہے

اور ریاکاری عام ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیئے! عوام ہمیشہ خواہی نخواہی ارباب اقتدار کے مسلک، نظریات، ذہنیت، حتیٰ کہ ان کی سیرت و کردار تک سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر نظامِ حکومت قرآنی خطوط پر متشکل نہیں اور ارباب اقتدار کی سیرت ابدی اقدار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نہیں تو وہ ہمیشہ مذہبی پیشوائیت سے خائف رہتے ہیں۔ اور کوئی بات ایسی نہیں کرتے جس سے وہ ناراض یا مخالف ہو جائیں۔ وہ ان سے ہر حال میں بنا کر رکھنے ہی میں مصلحت سمجھتے ہیں۔ مذہبی پیشوا ان سے اس کی قیمت وصول کرتے ہیں اور اس طرح ان دونوں گروہوں کے مفاد میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بات کسی سے ڈر کر، یا بربنائے مصلحت کی جائے، اس سے منافقت پیدا ہوگی۔ منافقت ان دونوں گروہوں کا شعار ہو تی ہے۔ مذہبی پیشوائیت، مذہب کو ابدی حقیقت نہیں سمجھتی۔ بلکہ اپنے مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھتی ہے اس لئے ان کی مذہب سے وابستگی مصلحت کوشی پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ "بنے ہوئے مقدس" ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، ارباب اقتدار کی طرف سے

مذہبی عقائد و رسوم سے تمسک، ملا کے ڈر کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے سراسر منافقت پر مبنی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ مذہبی پیشوائیت کی پراپیگنڈہ کی مشینری اس قدر وسیع اور منظم ہوتی ہے کہ دنیا کی کسی حکومت کی پراپیگنڈہ مشینری اسکی حریف نہیں ہو سکتی۔ آپ غور کیجئے کہ ملک میں کس قدر مساجد ہیں اور کہاں کہاں واقع ہیں ان میں سے ہر مسجد مذہبی پیشوائیت کے پراپیگنڈہ کا مرکز ہوتی ہے پھر مرکز بھی اس قسم کا کہ لوگ اس میں بغیر کسی دعوت، اعلان یا اشتہار کے ہر روز پانچ دفعہ خود بخود جمع ہو جاتے ہیں اور ہفتہ میں ایک بار اجتماع عظیم ہوتا ہے اس اجتماع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ خطیب جو کچھ جی میں آئے برسر منبر کہتا چلا جائے، خطبہ کے دوران، کسی اور کا بولنا شرعاً ممنوع ہوتا ہے۔ کیا اسی قسم کے منظم پراپیگنڈہ کی مشینری کی مثال آپکو کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟ اس مشینری کی قوت سے بے خوف وہی رہ سکتا ہے جسمیں کوئی ذاتی کمزوری نہ ہو۔ جن ارباب اقتدار کی زندگی اندرونی کثافتوں سے ملوث ہو وہ اس مشینری کی مخالفت کی جرأت کر ہی نہیں سکتے۔ وہ ان سے مفاہمت (COMPROMISE) ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ اس مفاہمت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار ان کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور یہ، ارباب اقتدار کے عیوب پر پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یحییٰ خاں جیسے فاسق و فاجر کے متعلق ——— کہ جس کا فسق و فجور، ننگا دھڑنگا، کوچہ و بازار میں پھرتا تھا ——— یہ کہا گیا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کے جانشین ہیں اور خلافت راشدہ کے منقطع شدہ رشتے کا احیاء ان کے ہاتھوں سے ہوگا ——— یہ ارشاد تھا جماعت اسلامی کے موجودہ امیر، میاں طفیل محمد صاحب کا!

"درویشی اور سلطانی" کی اس عیاری سے منافقت کی وبا پھوٹتی ہے اور سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ ہمارا معاشرہ اسکی زندہ شہادت ہے۔ پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم اس مملکت میں قرآنی نظام کا احیاء کر سکیں گے۔ یہ دعوےٰ مذہبی پیشوائیت کے لئے پیغامِ مرگ تھا۔ اس لئے ان کی طرف سے اسکی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ لیکن چونکہ اس دعویٰ کے علمبردار، قائداعظمؒ کے ذاتی کردار میں کوئی ایسی کمزوری نہیں تھی اس لئے وہ ان کی مخالفت سے قطعاً نہیں گھبرائے۔ شروع شروع میں انہوں نے انہیں "افرنگ زدہ" "ڈاڑھی منڈا، سوٹڈ بوٹڈ" کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ان کے متعلق یہ پراپیگنڈہ بھی کیا گیا کہ "ان میں اسلامی زندگی کی چھینٹ تک نظر نہیں آتی" حتیٰ کہ انہیں "کافرِ اعظم" تک بھی کہا گیا۔ لیکن اس مردِ بیباک نے ان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نتیجہ یہ کہ چند دنوں کی غوغا آرائی کے بعد یہ خاسر و ناکام پراپیگنڈہ خود بخود ختم ہو گیا۔ قوم نے اس پر کان تک نہ دھرا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ سارا لشکر ہجرت کر کے ادھر آ گیا۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد، زمامِ کار بالعموم ان لوگوں کے ہاتھ میں آتی رہی جن میں کیریکٹر کی کمزوریاں تھیں۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور حسبِ معمول اپنے پراپیگنڈہ کی مہم از سرِ نو شروع کر دی۔ جوں جوں ارباب اقتدار ان سے دبتے گئے، یہ قوی سے قوی تر ہوتے چلے گئے۔ انکی روز افزوں قوت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (حافظ نذر احمد صاحب، پرنسپل شبلی کالج لاہور، کی شائع کردہ رپورٹ کے مطابق) تشکیل پاکستان کے وقت، مغربی پاکستان میں کل (۱۳۷) دینی مدارس تھے۔ اور دار العلوموں کا نام اکا دکا نظر آتا تھا۔ اب یہاں (۸۹۳) عربی مدارس اور دار العلوم ہیں، جن میں چالیس ہزار سے زائد طلباء زیرِ تعلیم رہتے ہیں۔ جو طلباء ان مکاتب و مدارس سے نکلتے ہیں، انہیں اپنی معاش کے لئے

نئے مدرسوں اور مسجدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی نسبت سے ملک میں مدارس و مساجد کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اسقدر کثیر فوج کے منظم پراپیگنڈہ کی حریف کوئی حکومت بھی ہو سکتی ہے بالخصوص جب اربابِ اقتدار کی ناقی کمزوریاں انہیں ان سے ہر وقت خائف رکھتی ہوں۔ نتیجہ یہ کہ یہاں بجائے اس کے کہ قرآنی نظام کا احیاء ہوتا، تھیاکریسی مسلط ہو گئی۔ تھیاکریسی یعنی مذہبی پیشوائیت ہمیشہ

سیکولر حکومت

سیکولر اندازِ حکومت میں پنپتی ہے۔ سیکولر حکومت سے مراد یہ ہے کہ امورِ مملکت حکومت کے زیرِ اقتدار رہیں اور مسلمانوں کے پرسنل لاز، اربابِ شریعت کے زیرِ تسلط۔ جب تک یہ انداز قائم رہے، مذہبی پیشوائیت کے نقطۂ نظر سے اسلام بالکل محفوظ رہتا ہے۔ یہ اس وقت شور مچاتے ہیں، جب کوئی حکومت، ان کے دائرہ اقتدار میں دخل دینے کی کوشش کرے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ یحییٰ خاں کو جانشینِ حضرت علیؓ قرار دینے والی جماعت اسلامی نے ایوب خاں کے خلاف اس قدر شورش کیوں برپا کی تھی؟ اس لئے کہ اس نے عائلی قوانین کو مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اقتدار سے نکال کر حکومت کے دائرہ اختیار کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ آپ اس پر بھی غور کیجئے کہ ملک میں سینکڑوں ایسے قوانین رائج تھے جو کھلم کھلا اسلام کے خلاف تھے، دور نہ جائیے، زنا کو لیجئے۔ ملک میں زنا از روئے قانون جائز قرار دے دیا گیا تھا۔ (اور اب بھی وہی صورت ہے) اس کیلئے حکومت کی طرف سے باقاعدہ لائسنس جاری ہوتے تھے (اور ہوتے ہیں)، ان حضرات نے زنا کے خلاف کبھی محاذ آرائی اور مورچہ بندی نہ کی؛ لیکن عائلی قوانین کی مخالفت میں ہنگامے برپا کر دیئے۔ اس کیلئے یہ لوگ دلیل یہ دیتے تھے کہ اس سے زنا کے امکانات کے دروازے کھل جائیں گے۔ یعنی زناکاری کے وہ مراکز جن کے دروازے دن رات کھلے رہتے ہیں، ان کے خلاف آواز تک اٹھانے کی بھی ضرورت محسوس کی گئی، لیکن عائلی قوانین کے خلاف طوفان اس لئے برپا کیا گیا کہ ان سے (بقول ان کے) زنا کے امکانات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا! یہ سب دھوکا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ عائلی قوانین، پرسنل لا کے زمرے میں آتے تھے، جو مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اقتدار میں تھے۔ ان میں حکومت کی مداخلت کسی صورت میں روا نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ یہ ہنگامہ آرائیاں اسی لئے کی گئی تھیں۔ ان کی یہی ہنگامہ آرائیاں ہیں۔ جن سے ڈر کر اربابِ اقتدار کو منافقت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ میں ذاتیات میں نہیں جایا کرتا۔ ورنہ میں آپ احباب کو بتاتا کہ ان میں سے کتنے ہیں جو کمروں کے اندر بیٹھے، مولویوں کو گالیاں دیتے اور ان کے پیش کردہ اسلام پر تبرّیٰ بھیجتے رہتے ہیں، لیکن کمرے سے باہر نکل کر انہیں جھک جھک کر سلام کرتے اور ان کی ہفوات کو خدا و رسول کے ارشادات قرار دے کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ یہ جو آپ آئینِ پاکستان کے ہر ایڈیشن پر "منہ" کو زیبِ عنوان دیکھتے ہیں، تو یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ اسلامی آئین کا مطالبہ کرنے والے، اور اس مطالبہ کو پورا کرنے والے دونوں جانتے ہیں کہ جو اسلام، آئین میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ کبھی عمل میں نہیں آ سکتا۔ لیکن اس کے باوجود، ان الفاظ کو برابر دہرایا جا رہا ہے، اسی طرح جیسے ان کے ہر جلسہ کا آغاز "تلاوتِ قرآن پاک" سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ طلوعِ اسلام، قرآنی نظام کا داعی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی اس منافقت کا یہ اوّلین ہدف ہے۔ ایک طرف اربابِ اقتدار کی یہ حالت ہے کہ وہ طلوعِ اسلام کے اقتباسات سے اپنی تقریروں اور

تحریروں کو مزین کرتے ہیں لیکن اسکی سخت احتیاط برتتے ہیں کہ طلوع اسلام کا کہیں نام نہ آنے پائے، یا کوئی اس کا پرچہ ان کے ہاتھ میں نہ دیکھ لے۔ دوسری طرف، دینی مدارس کے اساتذہ اور طلباء میں سے بھی اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ چھپ چھپ کر طلوع اسلام کو پڑھتے رہتے ہیں اور برسرِ منبر اسے گالیاں بھی دیتے رہتے ہیں۔ ان کے اسی پراپیگنڈے کا نتیجہ ہے کہ طلوع اسلام کو (WET-PAINT) بنا دیا گیا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! جو کچھ مذہبی پیشوائیت کسی قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جب کسی قوم کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں، اور منافقت اور ریاکاری اسکا عام شیوہ ہو جائے، تو اس قوم کا شمار دنیا کی زندہ قوموں میں کسطرح ہو سکتا ہے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب تک کسی قوم پر مذہبی پیشوائیت مسلط رہی وہ دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکی۔ مذہبی پیشوائیت وہ "اکاس بیل" ہے جو خود تو بڑھتی، پھولتی، پھلتی رہتی ہے، لیکن جس درخت پر یہ چھا جائے وہ سوکھتا چلا جاتا ہے۔ آپ اقوامِ یورپ کو دیکھئے، جب تک انہوں نے اس اکاس بیل کو اتار کر نہیں پھینک دیا، زندگی کی تر و تازگی انکے نصیب نہیں ہوئی۔ یہ قومیں جو زمین کو چھوڑ اب آسمانی کرّوں تک کو مسخر کر رہی ہیں۔ تو اسی لئے کہ انہوں نے ان زنجیروں سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ قرآن شجرِ انسانیت کو اس اکاس بیل سے آزاد کرانے کے لئے آیا تھا چنانچہ اس نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اسکے بعد جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو یہ اکاس بیل پھر شجرِ ملت پر چھا گئی۔ حصولِ پاکستان، اسی نظام کے احیاء کی کوشش تھی جس سے شجرِ ملت، زندگی اور شادابی کو چوس لینے والی اس اکاس بیل سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن ان اسباب و علل کی وجہ سے جن کی طرف میں نے، پہلے اشارہ کیا ہے، ایسا نہیں ہو سکا۔ بلکہ یہ بیل اور زیادہ پھیل گئی ہے۔ یہ، اوپر کے طبقہ کی اندرونی کمزوریاں کی نسبت سے پھیلا کرتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس مقام پر آپ مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ تم نے شروع میں کہا تھا کہ میں مایوس

میں مایوس نہیں

نہیں۔ لیکن حالات کے تجزیہ کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ پھر تم مایوس کسطرح نہیں ہو؟ حالات یقیناً ایسے ہی ہیں، لیکن اس کے باوجود عزیزانِ من! قرآن کے طالبِ علم کے لئے مایوسی کی کوئی بات نہیں، شامِ صحرا کی سی ہولناک خاموشیوں اور عمقِ بحر کی سی روح فرسا تاریکیوں میں، یہ نشید جانفزا ہمارے کے لئے فردوسِ گوش بنتی رہتی ہے کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اے میرے بندو جو اپنے آپ پر زیادتیاں کر چکے ہو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ خدا تمہاری کوتاہیوں اور لغزشوں کے پیدا کردہ خطرات سے تمہاری حفاظت کا سامان پیدا کرے گا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ وہ سامانِ حفاظت بھی عطا کر دے گا اور اسبابِ رحمت بھی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے۔ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ تم اپنے نشوونما دینے والے کی طرف لوٹ کر آجاؤ قبل اس کے کہ آخری تباہی تمہیں آن گھیرے۔ اس صورت میں کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ کہ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ

اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَغْتَۃً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۔ (۳۹/۵۵) جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اس کی بطریقِ احسن پیروی کرو، قبل اس کے کہ آخری تباہی تمہیں اسطرح آن پکڑے کہ تمہیں پتہ ہی نہ چلے کہ یہ کہاں سے آگئی اور کیسے آگئی۔

قرآن نے یہ امیدوں بھرا پیغام آج سے چودہ سو سال پہلے، خطہ عرب میں بسنے والی قوم ہی کو نہیں دیا تھا۔ اس کا یہ پیغام آج بھی اُسی طرح زندہ و پائندہ ہے اور دنیا کی ہر اس قوم کیلئے حفاظت اور زندگی کی ضمانت کا مدعی جس نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہو۔ اس قسم کے پیغام کی موجودگی میں مایوسی کا کیا سوال! مایوس تو وہ ہو جو یہ سمجھے کہ اب اس پیغام میں، اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ یہ کسی قوم کو ازسرِ نو زندگی عطا کر سکے۔ اس نے جب بزبان حضرت یعقوبؑ کہا تھا کہ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۲/۸۷) تو اس سے یہی مقصود تھا۔ ہم مایوس اس لئے ہو جاتے ہیں کہ

(۱) یا تو ہمیں قرآن کی ابدی صداقتوں پر یقین نہیں رہتا۔ یا

(۲) ہم کامیابی اور ناکامی کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود، یا خاص قوم سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اور یا۔

(۳) ہم چاہتے ہیں کہ ہماری کوششوں کا نتیجہ ہماری زندگی میں محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔

میرے لئے قرآن کی ابدیت کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری تو زندگی اسی یقین کے سہارے قائم ہے۔ لہٰذا، میں باقی دو شقوں کے متعلق ہی بات کروں گا۔

قرآن کا پیغام جس طرح کسی خاص زمانے تک محدود نہیں، اسی طرح وہ کسی خاص خطۂ زمین میں بھی مقید یا کسی خاص قوم تک محصور نہیں۔ وہ ذکر للعالمین ہے۔ تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے، پیغامِ حیات۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ بیشتر اقوامِ عالم، قرآنی پیغام کے قریب آ رہی ہیں۔ قرآن نے اِلّا کی منزل تک پہنچنے کے لئے لَا کو مقدم شرط قرار دیا ہے۔ لَا کے معنی ہیں تمام غیر قرآنی تصورات و نظریات سے چھٹکارا حاصل کر لینا۔ دنیا کی کم و بیش تمام مہذب قومیں، مذہبی پیشوائیت سے نجات حاصل کر چکی ہیں، لیکن چونکہ ان کے سامنے زندگی کی کوئی مثبت اقدار نہیں تھیں اس لئے وہ لَا کے بحران سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ کچھ عرصہ تک تو وہ اس نجات کے جشن منانے میں مگن رہیں لیکن اس کے بعد انہوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ زندگی خلا میں نہیں گزاری جا سکتی۔ اس وقت اقوامِ مغرب کا عالمگیر اضطراب اسی شدتِ احساس کا دیوانہ وار مظاہرہ ہے۔ انہیں زندگی کی مثبت بنیادوں کی تلاش ہے اور وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتیں۔ میں یہ محض برنائے عقیدت نہیں کہہ رہا۔ علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں۔ اس نتیجہ پر میں، اقوامِ مغرب کے افکار کے مطالعہ ہی سے نہیں پہنچا، وہاں کے مفکرین اور ریسرچ سکالرز جو مجھے ملنے آتے ہیں، ان سے بالمشافہ گفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اس لئے میں قرآن کی ابدی صداقت یا نوعِ انسان کے مستقبل کی طرف سے کس طرح مایوس ہو سکتا ہوں۔ باقی رہا خطۂ زمین کا سوال، سو اس میں شبہ نہیں کہ جس سرزمین میں انسان رہتا سہتا ہے، جی چاہتا ہے کہ وہ سرزمین سب سے پہلے قرآنی روشنی سے منور ہو۔ ہر رسول نے اپنی تبلیغ کا آغاز اپنی قوم

ہی سے کیا تھا۔ میری بھی یہ انتہائی آرزو ہے کہ یہ خطۂ زمین، جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا، سب سے پہلے قرآنی اقدار کا گہوارہ بنے۔ لیکن اگر یہاں کے رہنے والے اس خوش بختی کے لئے آمادہ نہیں اور اپنی تباہی پر مُصر ہیں تو یہ آفتاب کسی اور سرزمین پر طلوع ہو جائے گا۔ لہٰذا اس میں مایوسی کی کونسی بات ہے۔

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

بلکہ یہ دیدہ ور تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

پاکستان کا مستقبل

جہاں تک خود سرزمین پاکستان کا تعلق ہے، میں تو یہاں بھی کچھ مشکل نہیں دیکھ رہا۔ اس وقت یہاں جن مشکلات کا سامنا ہے، انہیں ہمت سے برداشت کر جایئے اور کوشش کیجئے کہ کسی نہ کسی طرح یہ خطۂ زمین محفوظ رہے۔ اس کے بعد اگر آپ ایک الیکشن میں بھی ایسے لوگوں کو برسرِ اقتدار لے آئے جن کا ماضی داغدار نہ ہو اور جو (مُلّا کے پیش کردہ مذہب پر نہیں) قرآن کریم کی ابدی صداقتوں پر یقین محکم رکھتے ہوں، تو ایک ہی ہلے میں آپ کی کشتی کنارے پر جا لگے گی۔ جس قوم کو اسقدر اختیارات حاصل ہوں کہ وہ جس قسم کے لوگوں کو چاہے، برسرِ اقتدار لے آئے اور قرآن جیسے ضابطۂ ہدایت کی راہ نمائی بھی اسے حاصل ہو، وہ مایوس کیوں ہو؟ قصۂ ابلیس و آدم کی لِم اتنی ہی تو ہے کہ آدم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اس کا اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ آئندہ محتاط رہونگا۔ اس پر بازآفرینی کے دروازے کھل گئے۔ ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا کہ میں مجبور ہوں۔ صاحبِ اختیار نہیں۔ اس لئے میں اپنی غلطی کا ذمہ دار نہیں۔ اس سے کہا گیا کہ تو اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے تو تجھ پہ زندگی کے راستے کشادہ نہیں ہو سکتے۔ ابدی مایوسی تیرا مقدر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مایوس وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو مجبور سمجھنے لگ جائے۔ آپ تو یہاں آئینی طور پر بھی مجبور نہیں۔ صاحبِ اختیار ہیں۔ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ ماضی میں اپنے اختیارات کو صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکے تو آپ پر توبہ کے دروازے بند نہیں ہو گئے۔ آپ کے سارے (CHANCES) ختم نہیں ہو گئے۔ تھوڑا سا اور انتظار کیجئے اور ملک میں فساد برپا نہ ہونے دیجئے۔ اگلے ہی (CHANCE) میں اپنی غلطی کا ازالہ کر لیجئے — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ بقول مسٹر بھٹو، حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ملک محفوظ رہنا چاہیئے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۴ اکتوبر ۳ ۷ ۱۹ء)۔ یاد رکھیئے! قوم ایسی بانجھ نہیں ہو گئی کہ آپ کو تھوڑے سے بھی ایسے کار پرداز نہ مل سکیں جو قرآن کی صداقتوں پر یقین محکم رکھیں اور جن پر کلیتۂ اعتماد کیا جا سکے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

جس راہرو کے پاس یہ سازوسامان ہو، اور ہاتھ میں ہو قندیلِ نورانی، وہ راستے میں مایوس ہو کر کیوں بیٹھ جائے

مسلم استی؟ سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

لہٰذا، رفیقانِ سفر! میں تو خطۂ پاکستان کے مستقبل کی طرف سے بھی مایوس نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ جو ہمارے حالات

اس درجہ پریشان کن ہو گئے ہیں تو یہ بھی ہمارے حق میں بہتری ہے۔ اگر ابتری اتنی شدت اختیار نہ کر لیتی تو ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہی نہ ہوتا۔ درد کی شدت اپنے مرض کی طرف سے غافل بیمار کو علاج کے لئے مجبور کر دیا کرتی ہے۔

اس کے بعد تیسری شق کو لیجئے تو انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں کے منتہیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جسے اپنی زندگی میں اپنی کوششیں ثمربار ہوتی دکھائی نہ دیں، وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم تسلسلِ حیات کے عقیدہ سے اس قسم کی مایوسی کو بھی انسان کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ اسی قسم کی آرزو حضور نبی اکرمؐ کے سینۂ اطہر میں بھی ابھری تھی جب آپ نے (بزبانِ حال) کہا تھا کہ بارِ الٰہا! میری ساری زندگی اس تگ و تاز میں گذر جائے گی" یا میں اپنی کوششوں کو ثمربار ہوتے بھی دیکھ لوں گا۔ تو اس کا جواب ملا تھا کہ وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ - تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ تمہاری کوششوں کا نتیجہ تمہاری زندگی میں سامنے آجائے گا۔ یا اس کے بعد فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ - (۱۳/۴۰) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو عام کرتا جائے۔ اس کا حساب لگانا ہمارے ذمے ہے کہ یہ تخم ریزی بار آور کب ہو گی۔ تمہیں اس باب میں متردد نہیں ہونا چاہیئے، نہ ہی مایوس۔ مایوس وہ ہو جو سمجھے کہ موت سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جسے تسلسلِ حیات پر ایمان ہو، وہ مایوس کیوں ہو۔ اقبال کے الفاظ میں:

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر - چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا - کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

لہٰذا، عزیزانِ من! قرآن کا طالبِ علم، نہ اپنی ذات سے مایوس ہوتا ہے۔ نہ انسانیت کے مستقبل کی طرف سے مایوس اور یہی ہے وہ نشیدِ جاں فزا جسے قرآن بار بار ہمارے قلوب تک پہنچاتا ہے اور جیسا کہ میں نے آغاز درس میں بتایا ہے، جسے دہرانے کے لئے، خود خدا نے کائنات اس کے نزول پر جشنِ مسرت منانے کا حکم دیتا ہے جب کہتا ہے کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) یہ محض اللہ کا فضل و رحمت ہے کہ تمہیں قرآن جیسی متاعِ گراں بہا مل گئی ہے۔ سو اس عطیہ کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ اور یہی ہے وہ جشنِ مسرت جس پر میں آپ کی خدمت میں یہ کہتا ہوا ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ۔

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے - امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

والسلام

طلوعِ اسلام کی سولہویں سالانہ کنونشن

امسال **۲۳** تا **۲۵** نومبر ۱۹۷۲ء (بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار) حسب سابق بمقام **۲۵۔بی، گلبرگ** لاہور منعقد ہو رہی ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، تحریک طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق جو راہنمائی قرآن مجید سے ملے اسے (بغیر کسی ہنگامہ آرائی اور تفرقہ انگیزی کے) اس طرح عام کیا جائے کہ ارباب فکر و نظر قرآنی نہج پر سوچنے کے عادی ہو جائیں اور اس طرح قوم کے قلب و دماغ میں ایسی خوشگوار تبدیلی واقع ہو جائے جس سے یہاں صحیح اسلامی معاشرہ متشکل ہو جائے۔

۲۔ کنونشن کے کچھ اجلاس تو مندوبین تک محدود ہوتے ہیں اور کچھ ایسے جن میں عام احباب بھی سامعین کی حیثیت سے شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کھلے اجلاس میں پرویز صاحب کے بصیرت افروز اور حقیقت کشا خطابات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ملک جس بحران سے گذر رہا ہے اور قوم پر جو ہمہ گیر مایوسی چھا رہی ہے، اس کے پیش نظر اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امسال ان خطابات کے موضوع کس قدر اہم ہوں گے۔

۳۔ کنونشن کی ایک خاص نشست اس مذاکرہ کیلئے مختص ہوتی ہے جسمیں قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ (بالخصوص طلباء اور طالبات) حصہ لیتے ہیں۔ امسال مذاکرہ کا عنوان ہے۔

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے — اقبالؒ

۴۔ ایک شب مجلسِ استفسارات آراستہ ہوتی ہے جس میں مفکرِ قرآن جناب پرویز صاحب، مستفسرین کے سوالات کا جواب اپنے مخصوص بصیرت افروز انداز میں دیتے ہیں۔

۵۔ مندرجہ بالا پروگرام مختصراً ہے۔ تفصیلی اور حتمی پروگرام وسط نومبر تک شائع ہو جائیگا۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

ادارۂ طلوع اسلام کے

کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت

ادارۂ طلوع اسلام ہر سال کنونشن کی تقریب پر اپنی شائع کردہ کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت دیا کرتا ہے۔ یہ رعایت ان کتابوں پر جن کی فہرست درج ذیل ہے امسال بھی دی جائے گی بشرطیکہ جو کتابیں مطلوب ہوں ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر ۳ نومبر تک موصول ہو جائے۔ اسکے بعد وہ کتابیں بذریعہ ڈاک بھیجدی جائیں گی اور خرچ ڈاک وی پی کے ذریعے وصول کیا جائیگا۔ کنونشن کے موقعہ پر پنڈال کیساتھ بک سٹال قائم کر دیا جائے گا۔ کتابیں انہی قیمتوں پر وہاں سے بھی دستی خریدی جاسکیںگی۔

فہرست کتب جن پر رعایت دی جائے گی

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
مفہوم القرآن - (مکمل سیٹ)	۹۰/-	۸۰/-	قرآنی قوانین	۴/-	۳/-
لغات القرآن - (مکمل سیٹ)	۸۰/-	۷۰/-	قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ)	۱۵/-	۱۲/-
اسلام کیا ہے (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰/-	۸/-	سلیم کے نام (مکمل سیٹ)	۳۰/-	۲۴/-
اسلام کیا ہے (سستا ایڈیشن)	۶/-	۵/-	طاہرہ کے نام	۶/-	۵/-
انسان نے کیا سوچا	۱۵/-	۱۰/-	عربی خود سیکھئے	۶/-	۵/-
ابلیس و آدم	۱۵/-	۱۳/-	پاکستان کا معمار اول	۳/۵۰	۲/-
جوئے نور	۱۵/-	۱۳/-	فجر الاسلام (اول)	۵/-	۳/-
برق طور	۱۵/-	۱۳/-	فجر الاسلام (دوم)	۵/-	۳/-
کتاب التقدیر	۱۵/-	۱۴/-	منزل بہ منزل	۸/-	۴/-
قائد اعظم کے تصور کا پاکستان	۱۲/-	۱۰/-	ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION. (P. B)	۲۰/-	۱۵/-
معراج انسانیت	۲۵/-	۲۰/-	قتل مرتد - (غلام اور لونڈیاں)	۲/-	۱/-
سلسبیل	۱۰/-	۶/-	انسانیت کا آخری سہارا	۱/-	-/۵۰
فردوس گم گشتہ	۱۰/-	۶/-	عالمگیر افسانے	۱/-	-/۵۰
مقام حدیث	۵/-	۴/-	PRINCIPLES OF LAW MAKING IN ISLAM.	۲/۵۰	۱/۵۰
اسلامی معاشرت	۴/-	۳/-	دھتکارے ہوئے انسان	۵/-	۳/-
اسباب زوال امت (اعلیٰ)	۲/-	۱/-	تاریخ الامت (مکمل سیٹ)	۲۵/-	۱۹/-
اسباب زوال امت (سستا)	۱/-	-/۵۰	جمع القرآن	۲/۵۰	۲/-
جہاد	۲/۵۰	۱/۵۰			

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

سوراجی اسلام

ملت پاکستانیہ کی سب سے بڑی حرماں نصیبی یہ ہے کہ تحریک پاکستان کی کوئی ایسی قابل اعتماد تاریخ مرتب نہیں ہوئی جس میں بتایا گیا ہو کہ مطالبۂ پاکستان کے حقیقی محرکات کیا تھے اور اس خطۂ زمین کو حاصل کیوں کیا گیا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کے دل میں آہستہ آہستہ یہ خیالات ابھر رہے ہیں' یا ابھارے جا رہے ہیں کہ اس مطالبہ کے محرکات سیاسی اور معاشی تقاضے تھے اور چونکہ یہ تقاضے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں سوچنا چاہیئے کہ تقسیم ہند ہمارے لئے مفید بھی تھی یا نہیں۔ مطالبہ پاکستان کا بنیادی محرک نہ سیاسی تھا نہ معاشی۔ یہ خالص دینی تقاضا تھا۔ اس کی سرگزشت طلوع اسلام کے اس دور کے فائلوں میں محفوظ ہے، لیکن یہ فائلیں بھی یہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ہیں۔ قارئین طلوع اسلام کی طرف سے اکثر یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگر تحریک پاکستان کی اس قسم کی تاریخ مرتب ہونے کا امکان نہیں تو کم از کم اتنا ہی کیا جائے کہ اس دور کے طلوع اسلام میں شائع شدہ اہم مضامین کو حالیہ طلوع اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ اس سے اس تحریک کی تفصیل نہیں تو بنیادی تصور تو سامنے آجائے گا۔ ہمیں اس سے اتفاق تھا، لیکن طلوع اسلام کی تنگ دامانی اس تقاضے کو پورا کرنے کے راستے میں حائل رہی۔ اب ہم نے محسوس کیا ہے کہ اس سلسلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے اور جب بھی گنجائش ہو، انہیں شائع کرتے جانا چاہیئے۔ چنانچہ اشاعت حاضرہ سے اس کا آغاز کیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام کا پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا اور اس کی دوسری ہی اشاعت (بابت جون ۱۹۳۸ء) میں وہ معرکہ آرا مقالہ شائع ہوا جس کا عنوان تھا "سوراجی اسلام"۔ اس مقالہ نے (جس کی عام اشاعت پمفلٹ کی صورت میں بھی کی گئی تھی) ملک کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا جس سے متاثر ہو کر نیشنلسٹ مسلمانوں کی کثیر تعداد مطالبۂ پاکستان کی ہم نوا ہو گئی تھی۔ ہم اس سلسلہ کی ابتدا اس مقالہ سے کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے — "سوراجی اسلام"

(۰)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ چونکہ کانگریس کے دستور اساسی میں یہ بات موجود ہے کہ سوراج حاصل ہونے کے بعد ہندوستان کی مختلف اقوام کی مذہبی آزادی برقرار رکھی جائے گی تو پھر مسلمان اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے اور کیا ضمانت چاہتے ہیں۔ یہ دلیل ایسی نظر فریب اور خوش آئند ہے کہ اچھے اچھے سمجھ دار اس کے دام تزویر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اور عوام جو بالکل سطح بین ہوتے ہیں' ان کے پاس تو اس کا جواب ہی کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آیئے ذرا دیکھیں کہ قرآن

سے جو کچھ پتہ چلتا ہے اس کی رُو سے سوراج حاصل ہونے کے بعد جس مذہب کی آزادی مسلمانوں کو حاصل ہوگی وہ کون سا مذہب ہوگا۔ کیا وہ اسلام ہی ہوگا یا کسی اور چیز کا نام اسلام رکھ دیا جائے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سوراج کے بعد ہندوستان کی "متحدہ قومیت" کا نظامِ حکومت جمہوری ہوگا۔ اور اس متحدہ قوم کی تقدیروں کے مالک مختلف خیالات کے نمائندوں کی جماعت کے افراد ہوں گے جن کی کثرت آراء سے تمام معاملات کا فیصلہ ہوا کرے گا اور جو معاملہ کثرت کی رائے سے طے پا جائے گا وہ ملک کا قانون بن جائے گا جس کی خلاف ورزی جرم ہوگی۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ مختلف سیاسی معتقدات کی وہ جماعتیں جن کے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہوگی، مذہب سے مفہوم کیا لیتی ہیں۔ اس لئے کہ جب مذہبی آزادی یا مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا سوال پیدا ہوگا تو سب سے پہلے تو یہی سوال اُٹھے گا کہ وہ مذہب جس کی آزادی کا حکومت نے وعدہ کیا ہوا ہے اس کی تعریف کیا ہے۔ کون کون سے معاملات مذہب کی حدود کے اندر ہیں اور کون سے اس کے باہر۔

سب سے پہلے قدامت پسند ہندوؤں کی اُس جماعت کو لیجئے جس کے نمائندے مہاتما گاندھی ہیں۔ ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ یہ جماعت اپنے اس اعلان میں مخلص ہے کہ سوراج کے بعد مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اس جماعت کے نزدیک مذہب نام ہے چند رسومات کا اور چند عبادات کا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ عقاید یا عبادات میں بھی کسی کا اشتراک یا اتحاد ہو۔ ایک فرقہ کرشن بھگت ہے اور دوسرا رام اپاسک۔ سناتن دھرم والے مورتی پوجا کرتے ہیں۔ لیکن آریہ سماج والے مورتی کھنڈن (بت شکنی) کے قائل ہیں۔ ویدانت کے قائل مادہ کو مایا (سراب) سمجھتے ہیں۔ اور آریہ سماج روح اور مادہ دونوں کو ازلی اور ابدی مانتے ہیں۔ بنگال کے ہندو کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں اور ستیارتھ پرکاش اس دیوی کو ڈائن قرار دیتی ہے۔ سناتن دھرمی ورنوں کی تقسیم پیدائش کے لحاظ سے کرتے ہیں اس لئے اچھوت ان کے نزدیک پیدائشی اچھوت ہیں۔ لیکن آج خود مہاتما جی اس بات کے لئے پران تیاگنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ اچھوت کو اچھوت کیوں سمجھا جاتا ہے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود یہ سب ہندو ہیں اور ان میں سے کوئی بات بھی ہندو دھرم کے خلاف نہیں۔ حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو، جو ناستک ہیں، خدا کے بھی منکر ہیں، وہ بھی ہندو ہیں۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات (میری کہانی) میں علانیہ اس امر کی شکایت کرتے ہیں کہ میں نے ہندو دھرم ایک ایک بات کو چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ خدا کا بھی انکار کر دیا۔ لیکن ہندو دھرم پھر بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ مجھے ابھی تک برہمن قرار دیئے جاتا ہے۔ بدھ مت اور جین مت ایسے مذاہب ہیں جن کو دوسرے ہندوؤں کے مذہب سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں۔ وہ خدا کے قائل نہیں۔ ویدوں کو نہیں مانتے۔ ان کی اپنی کتابیں الگ ہیں۔ ہندو دھرم بدھ مت کو اسقدر "غیر ہندو" سمجھتا تھا کہ یہاں کے ہندوؤں نے تمام بدھوں کو ایک ایک کر کے برما، چین، تبت اور جاپان کی طرف نکال دیا۔ لیکن اب پھر بدھ مت اور جین مت کو ہندو دھرم کے دائرے کے اندر لیا جاتا ہے۔ اس لئے اس جماعت کے نزدیک تو مذہب محض کسی ایسے ذہنی نظریہ کا نام ہے جس کی کوئی تعریف ہی نہیں کی جا سکتی۔ باقی رہے معاشرتی، معاشی، سیاسی معاملات تو وہ مذہب کے احاطہ سے باہر ہیں۔ ان کا حل اربابِ سیاست کے ذمہ ہے۔ مذہب سے متعلق یہی نظریہ انگریزوں کے سامنے ہے۔ ان کے نزدیک بھی کلیسا اور سلطنت دو الگ الگ شعبے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے منشور کی رو سے آج بھی مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں "کامل آزادی" حاصل ہے، اور

حکومت مذہبی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتی۔ لیکن یہ مذہب ہے کیا جو حکومت کی مداخلت سے باہر ہے۔ وہی چند رسومات اور عبادات۔ آپ دن رات قرآن کریم کا درس دیتے رہیے کوئی مزاحم نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کسی آیت کی تفسیر حکومتِ وقت کے قانون سے ٹکرا جائے تو اس مذہبی آزادی کا جو حشر ہوتا ہے۔ اس کا حال مقدمہ کراچی کے اسیران اور مالٹا کے نظر بندوں سے پوچھئے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی تلاوت تو مذہب میں داخل ہے۔ لیکن ملکی اور سیاسی معاملات میں آپ کو ملک کے قانون کے تحت رہنا ہوگا۔ مذہب "ثواب" حاصل کرنے کے لئے ہے، نہ کہ زندگی کے معاملات کا عملی حل تلاش کرنے کے لئے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اس نظریہ کے ماتحت آپ کو جس قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی وہ آج کی "غلامی" سے کتنی بہتر ہوگی۔

قدامت پرستوں کی دوسری جماعت وہ ہے جس کی نمائندگی کا شرف ہندو مہاسبھا کو حاصل ہے اور یہی وہ جماعت ہے جس کی ملک میں اکثریت ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اُن کی اکثریت میں کچھ شبہ ہونے لگا تھا جب اچھوتوں نے تقاضا کیا تھا کہ ہمیں جداگانہ نیابت حاصل ہونی چاہیئے۔ اُس وقت اِن "مظلوموں" کی ہمدردی کے جذبہ نے جوش کھایا۔ بڑے بڑے مہاتما منش ہندوؤں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تُو دیں پران تیاگ برت رکھے گئے۔ بڑے بڑے اونچے گوت کے ہندوؤں نے اپنے آپ کو ہریجن کہلانا شروع کر دیا۔ اور اس مظلوم طبقہ کی زبوں حالی کے احساس نے اس وقت تک چین نہ لینے دیا جب تک یہ یقین نہ ہو گیا کہ ہندو مہاسبھا کی اکثریت خطرے میں نہیں رہی۔ مہاتما جی نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اب زندگی کا مقصد اسی اکثریت کے تحفظ کو قرار دے لیا ہے۔ اس طبقے کے جو خیالات مسلمانوں کے مذہب سے متعلق ہیں اس کے لئے دیوتا سروپ بھائی پرمانند، ڈاکٹر مونجے اور مسٹر ساورکر کے شبھ نام کافی ہیں۔ ان کی وہ آرزوئیں جو مسلمانوں کے خلاف ان کے سینوں میں موجزن ہیں ان کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> ملکی اور مذہبی نقطۂ خیال سے مسلمانوں کو ویدک دھرم اور ویدک تہذیب کے نزدیک لانا ضروری ہے۔
> جب تک مسلمان سرزمین حجاز کے عاشق ہیں، عرب کی سرزمین اور کھجوروں پر جان نثار کرتے ہیں اور کوثر کو گنگا پر ترجیح دیتے ہیں، وہ ہندوستان سے محبت نہیں کر سکتے۔ اس ملک میں ایک قوم پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم ویدک دھرم کا پیام جلد از جلد اُن تک پہنچائیں۔ (آریہ مسافر ۔ ۵ مارچ ۱۹۳۵ء)

اس قسم کی باتوں کے جواب میں مسلمانوں کو یہ کہہ کر فریب دیدیا جاتا ہے کہ یہ ہندوؤں کے متشدد، کٹر، متعصب مہاسبھائیوں کے خیالات ہیں۔ کانگرسی ہندوؤں کے ایسے خیالات نہیں۔ سو اوّل تو یہ چیز ہی محلِ نظر ہے کہ ایک کانگرسی ہندو کے مسلمانوں کے متعلق یہ خیالات نہیں ہوتے۔ جہاں تک اسلام سے متصادم ہونے کا تعلق ہے ہندو، ہندو ہی ہے خواہ وہ کانگرسی ہو، خواہ مہاسبھائی۔ بلکہ یہاں تک دیکھنے میں آیا ہے جو ہندو عیسائی ہو جاتا ہے جب عیسائی اور ہندو کا مقابلہ ہوتا ہے تو وہ عیسائی ہوتا ہے۔ لیکن جب ہندو اور مسلمان کا مقابلہ ہوتا ہے تو وہ پھر ہندو ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ کوئی غیر مسلم مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ فرمایا:۔

> اے پیروانِ دعوتِ ایمانی (يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا) ایسا نہ کرو کہ تم اپنوں کے سوا (من دونکم) کسی دوسرے کو اپنا ہمراز و معتمد بناؤ۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ تمہارے خلاف فتنہ انگیزی میں کمی کرنیوالے نہیں جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہی انہیں پسندیدہ ہے۔ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں ہی سے ظاہر ہے لیکن

جو کچھ دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو ہم نے فہم و بصیرت کی نشانیاں تم پر واضح کر دیں۔ (ترجمہ از مولانا ابوالکلام - ترجمان القرآن جلد ۱ صفحہ ۳)

یعنی قرآن کریم نے خود غیر مسلموں کی ہر دو جماعتوں کی تفریق کر دی۔ ایک وہ جن کی اسلام سے دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے وہ جو بات کہنے میں محتاط رہتے ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے بڑھ کر ہے جو ظاہر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں سے صاف طور پر ظاہر فرما دیا ہے کہ اسلام کے ساتھ دشمنی میں سب غیر مسلم شامل ہیں اور ان کے ساتھ راز اور اعتماد کے تعلقات قطعاً جائز نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ کانگرسی ہندو مسلمانوں کا دشمن ہے؛ مہاسبھائی ہندو دشمن ہے نہ صرف خود فریبی ہے بلکہ قرآن کریم کی کھلی ہوئی تکذیب بھی ہے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ہندوؤں میں اکثریت کن کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثریت مہاسبھائیوں کی ہے اور چونکہ جمہوری نظام میں فیصلے اکثریت کی مرضی کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ اس قسم کی اکثریت کے ماتحت مسلمانوں کو کس قسم کے مذہب کی آزادی حاصل ہوگی۔ اکثریت کی تو آج بھی یہ حالت ہے کہ سناتنی بچارے لاکھ چلا رہے ہیں کہ سارا ایجیٹیشن ہمارے دھرم کے خلاف ہے، کوئی ایک نہیں سنتا۔ وہ چیخ رہے ہیں کہ اچھوتوں کے لئے مندروں کے دروازے کھول دینا ہندو دھرم کو اُتو تر کر دینا ہے۔ لیکن سیاست کی مصلحت کوشیاں اکثریت کے کان بند کئے ہوئے ہیں۔ حکومت بمبئی نے اعلان کر دیا ہے کہ پونا کے ہوٹلوں میں اچھوتوں کو بھی رہنے کی اجازت ہے۔ اس پر وہاں کے ہوٹل والے شور مچا رہے ہیں کہ اونچی ذات کے ہندوؤں نے ہمارا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ ہمارا کاروبار تباہ ہو رہا ہے۔ لیکن وہاں کانگرسی حکومت اس کی پرواہی نہیں کر رہی۔ جب ان کی خود اپنے ہاں یہ حالت ہے کہ مہاسبھائیوں کی اکثریت سناتن دھرمیوں کے مذہبی احساسات کی کچھ پروا نہیں کرتی تو یہی اکثریت "ملیکش" مسلمانوں کے مذہب کا جس قدر پاس کرے گی ظاہر ہے۔

اب اس جماعت کو لیجئے جو روشن خیال جدت پسند (ADVANCED) طبقہ کہلاتا ہے اور جس کی قیادت پنڈت جواہر لال نہرو کو حاصل ہے۔ یہ اشتراکی خیالات کے حامی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں خدا اور آخرت پر ایمان کے عقیدہ کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ روس میں اسلام ہی کا نہیں بلکہ خود عیسائیت کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ جو ان خیالات سے متاثر کیا جا رہا ہے، ایمانیات سے اس کا استہزا خود بتا رہا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا زاویہ نگاہ کیا ہے۔ پنڈت جی اور ان کے رفقاء کار کی یہ کوشش ہے کہ اشتراکیت آنے والے ہندوستان کا سیاسی مذہب بن جائے۔ اس نظریہ کی عملی اشاعت میں بعض سیاسی مصالح ابھی ان کے راستہ میں حائل ہیں۔ لیکن بایں ہمہ جس سرعت کے ساتھ اس کو عام کیا جا رہا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اسلام خود سرمایہ داری کا دشمن اور اشتراکیت کا حامی ہے لیکن اُس اشتراکیت کا نہیں جس کی تخلیق روس کے انقلاب پسند طبقہ کے اس انتقامی جذبہ کی رہین منت ہے جو زار کی حکومت کے خلاف اس کے دل میں موجزن تھا اور جس کا اصول صرف یہ تھا کہ ہر وہ چیز جو زار کے وقت میں دنیا میں موجود تھی، تباہ کر دینے کے لائق ہے۔ یہی وہ اشتراکیت ہے جو ہندوستان کے انقلاب پسند طبقہ میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور جو محض روس کی نقالی ہے۔ غلام نژاد قوم ہمیشہ مقلد ہوا کرتی ہے۔ طوافِ اندر سرشت برہمن است[1] رسالہ کلیم اِس مسلک کی نشر و اشاعت میں بڑا سرگرم رہتا ہے کہ اس سے نوجوانوں میں مقبولیت بڑھ جاتی ہے۔

---

[1] یہ رسالہ جوش ملیح آبادی کا تھا جو پاکستان میں براجمان ہیں۔

چنانچہ اس کا شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہو جس میں خدا اور آخرت پر ایمان کی تضحیک نہ کی جاتی ہو۔ مثلاً مارچ ۱۹۳۵ء کے پرچہ میں ناظر کے نام سے ایک مضمون چھپا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

> خدا کے تصور کی ابتداء انسان کے اس دور سے شروع ہوئی جب کہ ذہنِ انسانی عالمِ طفولیت میں تھا۔ وہ فطرت کے عظیم الشان مظاہرہ کی توجیہہ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ ان کو فوق العادہ ہستی سے منسوب کر دے۔ . . . . . مذہب کا توہم پرستی کے ساتھ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ آج تک بھی جہاں جہاں جہالت زیادہ ہے اور علم کی روشنی کم ہے۔ وہاں مذہب کا دور دورہ ہے۔ مذہب ایک غیبی چیز ہے اور غیبی چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے۔

اس کے بعد حیات بعد الممات کے عقیدہ کی مخالفت کی گئی ہے۔ آخر میں رقمطراز ہیں کہ۔

> ہندوستان چونکہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں بہت پیچھے ہے اس لئے یہاں فی الحال مذہب کو رہنے دیا جائے۔ لیکن مذہب کو اجتماعی حیثیت نہ دی جائے۔ اس کو خالص شخصی یا انفرادی چیز سمجھنا چاہیئے اس طرح اس کی پبلک حیثیت رفع ہو کر خالص پرائیویٹ یا نجی حیثیت باقی رہے گی۔

یعنی ملک کا جدت پسند طبقہ جس مذہب کی "فی الحال" آزادی پر رضامند ہو سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ اسے عملی اجتماعی اور معاملات کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ پچھلے دنوں جب مسٹر نہرو نے اعلان کیا کہ "میں سب کچھ مسلمانوں کے حوالے کر دینے پر تیار ہوں بشرطیکہ وہ کانگرس کے متحدہ قومیت کے نظریہ کو تسلیم کر لیں" تو اس کی وضاحت کے لئے ٹریبیون نے اپنی ۷ رجون ۳۵ء کی اشاعت میں مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ:-

> بس ایک شرط کے ماتحت۔ طول و عرض ملک میں کوئی ایک کانگرسی بھی ایسا نہ ہوگا جو تمام اختیارات مسلمانوں کے حوالے کر دینے پر آمادہ نہ ہو (ان کے (یعنی کانگرسیوں کے) نزدیک یہ مسئلہ ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتا کہ کانگرس یا حکومت کے دائرے میں زمامِ اختیار جس کے ہاتھ میں ہے وہ ہندومت، اسلام یا عیسائیت کے عقیدہ کا معتقد ہے کیونکہ ان کے نظریہ کی رو سے مذہب کو سیاست سے نہ کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی ہونا چاہیئے۔

(۷)

ابھی حال ہی میں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے شملہ میں ایک جلسہ میں تقریر فرمائی جس میں انہوں نے بتایا کہ عہد حاضرہ میں بہترین نظامِ حکومت کس قسم کا ہو سکتا ہے۔ اور آزاد ہندوستان کا نظامِ حکومت کیسا ہوگا۔ تقریر کی تمہید میں جو کچھ انہوں نے کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ عہد قدیم میں چونکہ بادشاہ اور حکمران جماعتوں کے ارکان یہ چاہتے تھے کہ ان کے احکام بے چون و چرا تسلیم ہوتے چلے جائیں اور کسی کو ان پر تنقید کرنے کا حق حاصل نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے یہ خیال پیدا کیا کہ ان کی حکومت الہامی قوانین (DIVINE LAWS) پر مبنی ہے۔ یعنی خدا کی ہستی پر ایمان پیدا کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی۔ یہ حرف بحرف وہی اعتراض ہے جو اشتراکیت کے بانی مارکس نے مذہب کے خلاف عائد کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اب علم و عقل کا زمانہ آگیا ہے۔ اب اس قسم کی توہم پرستی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

نظامِ حکومت کے متعلق انہوں نے فرمایا:

اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں اور اُسے اچھی طرح سے ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے، اور انہیں زمین کے معاملات میں خواہ مخواہ گھسیٹ کر نہ لایا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے اور اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم ہو سکتا ہے یا جذبۂ حبّ الوطنی محض قومیت پرستی کی بنیاد پر پرورش پا سکتا ہے جیسی اس مادرِ مجوسی کے ساتھ وابستہ ہو جانے سے جس نے تمہیں پیدا کیا، زندگی عطا فرمائی اور مرنے کے بعد جو تمہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بناء اس نظریہ پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود اربعہ کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو (وطن) اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۵ ستمبر ۱۹۳۸ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ وہی نظریہ کہ:-

(۱) مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔

(۲) نظامِ حکومت میں ضمیر، مذہب اور خدا کو کوئی دخل نہ ہو۔

(۳) جذبۂ حب الوطنی کی پرورش محض قومیت پرستی کی بنا پر ہو سکتی ہے۔

(۴) اقوام اب اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے۔

(۵) افراد کو ایک قوم بنانے کے لئے وجہِ جامعیت سیاسی اور معاشی مفاد ہیں نہ کہ مذہب۔

ہمارے قومیت پرست علمائے کرام یہ سب کچھ سنتے ہیں اور ایک لفظ اس کی تردید میں نہیں کہتے۔ تردید کیسی؟ وہ خود ان خیالات کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ خدا کے لئے کوئی بتائے کہ کیا اسلام دنیا کو یہی کچھ سکھلانے کے لئے آیا تھا؟

یہ تو تھے غیر مسلم حضرات کے مختلف طبقے یا مسلمان کہلانے والوں میں سے وہ طبقہ جسے متشددین کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آنے والے اسلام کے متعلق جو نظریہ عام" قومیت پرست مسلم" حضرات پیش کرتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن ہے۔ ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کا اسلام وہ پیش کر رہے ہیں وہ خود اُن کے اپنے ہی دماغوں کی ساخت ہے، کتاب و سنت کے اسلام سے اس کو کچھ علاقہ نہیں۔ اُن کے نزدیک بھی مذہب چند رسومات و عبادات کا ہی نام ہے۔ معاشرتی معاشی سیاسی معاملات سب "دنیاوی" امور ہیں جن کا مذہب سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثال کے طور پر دو ایک مشہور "قوم پرست مسلم" حضرات کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر سید محمود سابق سیکرٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور کانگرسی حکومت صوبۂ بہار کے وزیر کا ایک مضمون رسالہ جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا۔ اس میں انہوں نے اس امر کی تلقین کی تھی کہ ہندوستان جیسے ملک میں مذہب اس قسم کا ہونا چاہیئے جس قسم کا دینِ اکبر نے ایجاد کیا تھا۔ اکبر جیسوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:-

بعض نے اپنے ولولہ وجوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ اُن لوگوں کی مجموعی خدمات نہیں کہی جاسکتیں۔

آنے والے نظامِ حکومت کے ماتحت اس نئے "دینِ الٰہی" کے ماننے والوں کا نام کیا ہوگا؟ اسکے متعلق ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

لفظ ہندی کو زبان کے لئے نہیں بلکہ اہلِ ہند کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں، صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برِ اعظم کی علیحدہ علیحدہ "مذہبی اقوام ہیں"۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم ایک مشترک نام اختیار کریں۔

کانگرس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب کا ایک مضمون جمعیۃ العلماء ہند کے آرگن الجمعیۃ بابت رجب ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں پہلے کون سی بات میں یگانگت اور وحدت تھی جو اب وہ اپنی الگ وحدتِ قومی کے لئے چلا رہے ہیں۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

اسی اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔

اس شعبۂ اسلامیات کے ایک رکن جناب منظر رضوی کا ایک مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار مدینہ بابت یکم نومبر ۱۹۳۷ء شائع ہوا ہے۔ جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانوں مل جاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے مسلمان آپس میں کیوں ملیں۔ اس اتحاد کی ضروریات کیا ہے، اس کا مقصد کیا ہے جہاں تک توحید، رسالت، مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے۔ وہ آپس میں ملے ہوئے ہیں، بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لئے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے، وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے۔ اور نہ اُن کو متحد ہونا چاہیئے۔

رسالہ کلیم کے مدیر دسمبر ۱۹۳۷ء کے پرچے کے اشارات میں فرماتے ہیں :۔

اس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافیائی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد، ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جاسکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔[1]

ایک اور "قوم پرست" "بزرگ" مولانا عبدالحق ملیح آبادی ہیں۔ وہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے مشہور نظریہ قومیت

---

[1] جوش صاحب اب پاکستانی قومیت اختیار کر چکے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

سے متعلق بیان کے جواب میں اپنے اخبار "سندھ" بابتہ ۱۷ مارچ ۱۹۳۸ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

ہمارے مدعیانِ علم نے مشہور کر رکھا ہے کہ اسلام نے اسلامی سوسائٹی کا ایک ایسا نظام بنایا ہے جو ہمہ گیر اور اٹل ہے مگر یہ کہتے ہوئے اُن لوگوں کو یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے اس قول سے اسلام کی عالمگیری کو توڑ رہے ہیں۔

ان کے نزدیک اسلام کی عالمگیری یہ ہے کہ اُسے چند عقائد کا مجموعہ تصور کر لیا جائے۔ باقی رہا نظام سو وہ تو ایک وقتی چیز تھی جو اسلام نے عربوں کے سامنے پیش کی تھی۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

اس حقیقت سے عام طور پر چشم پوشی کی جاتی ہے کہ اسلام عربی دین ہے۔ اس کی روح عربی ہے اور عربوں ہی نے سب سے زیادہ اس سے فائدہ اٹھایا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ عجمی قومیں اسلام میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ وہ داخل ہوئیں اور مسلمان بنیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اسلام ہے عربی دین ہی جس کی شہادتیں خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔

اس سے ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے اور ہر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ قرآن میں تفصیلی قوانین موجود نہیں ہیں۔ قرآن نے چند عام اُصول بتا دیئے ہیں اور مسلمانوں سے کہہ دیا ہے کہ اچھائی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو۔ قرآن کہتا ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ معروف بھلائی اور منکر برائی۔ لفظی معنی مشہور یا معلوم اور نامعلوم یا ناپسندیدہ۔ دیکھیئے قرآن نے بھلائی کو لفظ معروف یعنی معلوم سے تعبیر کیا اور برائی کو لفظ منکر یعنی نامعلوم اور ناپسندیدہ سے۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ اچھائیوں اور برائیوں کی فہرست دیدی ہو، بلکہ عام بات کہی کہ اچھائی کو پھیلاؤ اور برائی کو روکو۔ اور یہ اس لئے کہ سوسائٹی کے حالات بدل جانے سے اچھائی اور برائی کے مفہوم اور معنی بھی بدل جاتے ہیں۔

اس وقت ان دعاوی کا تجزیہ کر کے اُنکے بطلان کی توضیح کا موقعہ نہیں۔ اس وقت صرف اتنا کہنا مقصود ہے کہ ہمارے قومیت پرست مسلمان حضرات کے نزدیک "مذہب" کی حیثیت کیا بنتی چلی جا رہی ہے۔ یعنی مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ اسے سیاست سے کوئی علاقہ نہیں۔ مسلمان بھلا نا بڑی تنگ نظری ہے۔ بلکہ یہ فطری قانون کے خلاف ہے۔ اسلام کوئی ایسا نظامِ زندگی نہیں دیتا جو ہمہ گیر اور اٹل ہو۔ اسلام فقط عربی دین ہے۔ قرآن تفصیلی احکام نہیں دیتا۔ حتٰے کہ نیکی اور بدی کا مفہوم بھی سوسائٹی کے حالات کے ماتحت بدلتا جاتا ہے۔

اللہ اکبر! نہ معلوم پھر اسلام ہے کیا؟

اب ایک اور قوم پرست (نیاز فتح پوری) سے سنیئے کہ مسلمانوں کو کانگرس میں کیوں شریک ہونا چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔

لیکن ان کا (مسلمانوں کا) باہمی اختلاف جو زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دور نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے دُور کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کسی ایسے ادارے میں شریک ہو جائیں جو مذہبیات سے بالکل علیحدہ صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہو اور ایسا ادارہ صرف کانگرس[1] ہے۔

---

[1] مسلم لیگ ہی کو ایسا ادارہ فرض کر کے نیشنلسٹ مسلمان اس میں کیوں نہ شامل ہو جائیں۔ ۔۔ ۱۲ (منہ)

کانگرس میں شریک ہونے کے بعد تو مسلمان بے شک کسی ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں لیکن اس سے علیحدہ رہنے کی حالت میں ان کے مذہبی اختلافات ان کی سیاسی تحریکوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیں گے۔

(نگار بحوالہ مدینہ مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۳۸ء)

یعنی وہی نظریہ کہ مذہب ایک الگ چیز ہے اور سیاست الگ، اور چونکہ مذہب نے مسلمانوں میں اس قدر اختلافات پیدا کر رکھے ہیں اس لئے مسلمان کسی ایسے مرکز پر پہنچ جائیں جس میں مذہب کو دخل نہ ہو اور وہ مرکز کانگرس ہے۔ یعنی مسلمانوں کے اختلافات مٹانے والا مرکز قرآن نہیں ہے بلکہ کانگرس ہے۔ جل جلالہٗ

اسی قسم کے ایک اور قوم پرست کا نظریۂ مذہب ملاحظہ ہو :-

ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ گاندھی اور جواہر لال مسلمانوں کے لیڈر کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اسکے جواب میں انہوں نے اپنے اخبار میں تو یہ فرمایا کہ اگر لیڈر کے سے مراد مسلمانوں کی دینی امامت و قیادت ہے تو یہ اعتراض درست ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد سیاسی راہنمائی ہے تو بے شک وہ قائد و امام ہو سکتے ہیں۔

(زمزم لاہور۔ مورخہ ۱۵ جون ۱۹۳۸ء)

یعنی دینی امامت و قیادت الگ شے ہے اور سیاسی قیادت و امامت الگ۔ اولی الامر منکم (تمہارا امام تم میں سے) کا حکم صرف "دینی قیادت" کے لئے ہے۔ "سیاسی قیادت" میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی قید نہیں۔ چرچ اینڈ سٹیٹ مذہب اور سیاست کی تفریق کی اس سے بین مثال بھی کہیں مل سکتی ہے؟

اس اعتراض کا اس سے بھی دلچسپ جواب ایک بہت بڑے جید عالمِ دین نے دیا۔ انہوں نے فرمایا "جناح کا فوٹو دیکھا۔ اگر جواہر لال قائد نہیں ہو سکتا تو جناح کیسے ہو سکتا ہے"؟

(اقتباس تقریر حضرت مولانا حسین احمد صاحب۔ مطبوعہ زمزم۔ مرجولائی ۱۹۳۸ء)

اسی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ "جواہر لال ہندو ہے اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے"۔ یعنی قرآن کریم تو کہتا ہے کہ لا یألونکم خبالاً۔ غیر مسلم تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ودّوا ما عنتم۔ ان کو تو پسند وہی چیز ہے جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ (سورۂ آل عمران) اور حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ جواہر لال باوجود غیر مسلم ہونے کے (من دونکم ہونے کے) مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے۔

کہیئے کس کی مانیں — !!

یہ چند تصریحات بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں، ورنہ اگر ان حضرات کی تمام و کمال تحریریں آپ کے سامنے ہوں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ یہ کس قسم کا اسلام ہے جسے پیش کیا جا رہا ہے۔ ماحصل ان سب کے نظریوں کا یہ ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے جس کا عملی سیاسیات اور معاشی، اقتصادی، عمرانی، معاشرتی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہی چیز جس کا نام مولانا ابوالکلام آزاد نے "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی رکھا ہے اور جس میں اس متحدہ قومیت کا مشترکہ مذہب بننے کی صلاحیت موجود ہے جس کی بنا، بقول حضرت مولانا حسین احمد، اوطان پر ہے۔ یہ ہے وہ مذہب جس کی آزادی کا اعلان بھارت ماتا کے مندر کے دروازہ پہ لٹکایا جا رہا ہے۔ اب آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ اس قسم کے مذہب کی "آزادی" سے مفہوم کیا ہوگا۔

برعکس اس کے اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے جو نظامِ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی حیثیت پر چھایا ہوا ہے۔ بقول حضرت علامہ علیہ الرحمۃ۔

اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔

(معرکۂ دین و وطن ۔ علامہ اقبالؒ)

اس اجمال کی تفصیل طلوع اسلام کے مسلسل مطالعہ سے آپکی نگاہوں کے سامنے آجائے گی کہ جب تک مسلمانوں کو اس قسم کے مذہب کی آزادی حاصل نہ ہو۔ وہ اپنے آپ کو مذہبی حیثیت سے آزاد نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وہ مذہبی آزادی ہے جس کے تحفظ کے لئے آج مسلمانوں کا ہر سوچنے والا دماغ غور و فکر کر رہا ہے اور اسی کا نام آج فرقہ پرستی رکھا جاتا ہے۔ اور یا للعجب! کہ خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے رکھا جاتا ہے!!

از باغباں رسد است کہ صبا داں نکرد۔

یاد رہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے جس میں دین اور دنیا، مذہب اور سیاست، گرہست آشرم اور سنیاس آشرم، الگ الگ شعبے نہیں، انسانی زندگی سے متعلق کوئی مسئلہ ہو اور دنیا اسے اپنی تقسیم کے اعتبار سے کسی ذیل میں لے آئے اسلام کی رُو سے وہ خالص مذہبی مسئلہ ہوتا ہے۔ اسلام کی رُو سے (عام مفہوم میں) فرد کوئی ہستی نہیں رکھتا اس لئے اس کے انفرادی اور ذاتی اعمال بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ وہ ایک جماعت کا رکن ہے اور اس کی ہستی اس جماعت کے وجود سے ہے۔ لہٰذا اس کے اعمال بھی وہی صالح ہیں جو اس جماعتی نظام کے اندر رہتے ہوئے کئے جائیں۔ "پرائیویٹ مذہب" زیادہ سے زیادہ چند اخلاقیات کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ اور یہ سطحی مجموعۂ اخلاقیات وہ ہے جو قریب قریب دنیا کے ہر مذہب میں مشترک ہے۔ کونسا مذہب ہے جو یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ زنا نہ کرو۔ اگر مذہب اتنی ہی چیز ہے تو پھر اسلام میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی رُو سے اس کا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کا آخری اور مکمل دین ہے اور اس سے پیشتر کے تمام ادیان اب اس لئے ناقابلِ قبول ہیں کہ وہ اپنی اصلی شکل میں دنیا کے پاس نہیں ہیں۔ جو لوگ اسلام کی روح سے کچھ بھی واقف ہیں انہیں اس خصوصیت کا معلوم کر لینا کچھ زیادہ دشوار نہیں جس کی رُو سے اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا سچا دین ہے۔ آپ اسلام کے سوا کسی مذہب کو دیکھئے، وہ ایک پرائیویٹ حیثیت رکھتا ہوگا، وہ انفرادیت کی زندگی بسر کرنا سکھائے گا۔ ہندوؤں کے پجاری ہوں یا سنیاسی، عیسائیوں کے پادری ہوں یا راہب، وہ دنیا دار کے طبقہ سے الگ ہوں گے۔ "دنیا داروں" میں سے جو شخص "خدا پرست" ہوتا جائے گا وہ ان سے کٹ کر الگ ہوتا جائیگا۔ اسے پھر جماعتی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رہے گا۔ اس کا مطمحِ نگاہ پھر اپنی مکتی حاصل کرنا ہوگا۔ اسلام نے جب رہبانیت کو ناجائز قرار دیا تو اس لئے نہیں کہ لوگوں کے گیروے رنگ کے کپڑے پہننے اسے پسند نہ تھے۔ ان کپڑوں میں رکھا کیا ہے؟ اسلام نے رہبانیت کی اس لئے مخالفت کی کہ رہبانیت اس نظریۂ زندگی کا نام ہے جس میں انسان انفرادیت کی زندگی بسر کرتا ہے جہاں اُسے صرف اپنی نجات کی فکر دامنگیر رہتی ہے۔ جس میں دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے

بن جاتے ہیں جس میں مذہب ایک ذاتی اور پرائیویٹ عقیدہ کا نام رہ جاتا ہے جس میں خدا پرستوں کے طبقہ کو اجتماعی معاملات سے کچھ علاقہ نہیں رہتا۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلام اور دیگر ادیان میں۔ اس خصوصیت کو مٹا ڈالئے تو اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح رہ جائے گا اور اسی بنیادی فرق کو مٹانے کا نتیجہ ہے کہ قوم پرست حضرات کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ دنیا کے سب مذاہب سچے ہیں۔ البتہ ان مذاہب کے پیروؤں میں خرابیاں آگئی ہیں۔ اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی سچائی پر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر کسی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ترجمان القرآن جلد اول۔ از مولانا ابوالکلام آزاد۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> قرآن کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال تھا کہ تمام پیروانِ مذاہب، مذہب کو صرف اس کے ظواہر و رسوم ہی میں دیکھتے تھے اور مذہبی اعتقاد کا جوش و خروش اسی طرح کی باتوں میں سمٹ آیا تھا۔ ہر گروہ یقین کرتا تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم ہے کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ دوسرے کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل و حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ لیکن روح و حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصلی دین ہے۔ اصلی دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی اور کو نہ ملا ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔
>
> (ترجمان القرآن جلد ۱ ص ۱۳۱)

اس اقتباس کی اور باتوں کو چھوڑ دیئے۔ صرف اس چیز کو دیکھئے کہ حضرت مولانا کے نزدیک "اصل دین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے" "یکساں طور پر"۔ فرمایئے! اسلام کو دیگر ادیان پر کیا تفوق اور فضیلت رہی؟ اس کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پمفلٹ "واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" شائع کردہ طلوعِ اسلام دہلی[1]۔

ہم اپنے اس دعویٰ کو کہ اسلام پرائیویٹ عقیدہ نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے، بتوفیقِ الٰہی کتاب و سنت، آثار و تاریخ سے پوری طرح ثابت کر سکتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کا وجود ہی اس غرض کے لئے ہے۔ لیکن اس وقت ہم اس دعوے کے اثبات میں ایک دوسری روش اختیار کریں گے۔ ہم نے شق اول میں بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ قوم پرست طبقہ کے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ وہ مذہب کو کیا سمجھتے ہیں۔ اب ہم اس "مسلم قوم پرست" طبقہ کے امام مولانا آزاد کے الفاظ میں اس بات کو ثابت کریں گے کہ مذہب اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک منظم مذہب ہے جماعتی مذہب ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ تحریریں اس وقت کی ہیں جب انہوں نے "قوم پرستی" کا مسلک اختیار نہیں کیا تھا۔

۱۹۱۲ء میں انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک ریزولیوشن پاس کر دیا کہ شاہی مسجد میں "سیاسی" تقریریں کرنے کی اجازت نہیں۔ اس پر مولانا آزاد نے اپنے رسالہ الہلال میں چار مبسوط اور مفصل افتتاحی مقالے تحریر فرمائے۔ جن میں اس جوش اور ولولے کے ساتھ جو زمانۂ قومیت پرستی سے پیشتر اُن کی نمایاں خصوصیت تھی، انہوں نے کتاب و سنت سے ثابت کیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ سمجھنا کفر ہے، شرک ہے، جہالت ہے۔ فرماتے ہیں۔

---

[1] ہم اسے بھی عندالضرورت شائع کر دیں گے۔ (طلوعِ اسلام)

میں اگر ان کو کفر پرست کہوں تو تم کہو گے کہ یہ ایمان و کفر کی بحث ہے۔ میں اگر ان کو مشرک کہوں تو تم پکارو گے کہ بہت ہی بڑی جسارت ہے۔ ہاں یہ جسارت ہے۔ لیکن جن ظالموں نے اللہ کے آگے جسارت کی ہے، کیوں نہ ہم بھی اُن کے لئے جسارت کریں۔ وہ نہ مومن ہیں نہ مسلم۔ ان کا حال یہ ہے جو کہا گیا نؤمن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا۔ ان لوگوں کی اصطلاح میں جس چیز کو سیاست اور پالٹکس کہتے ہیں اسلام کے نزدیک عین دین و مذہب ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(الہلال ۔ بابت ۹؍اکتوبر ۱۹۱۲ء ۔ ص۱۶)

اس لئے کہ :۔

حضرت ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کو دور کرنا چاہا اور اپنی اور اپنی جماعت مقدس کی زندگی اس راہ میں صرف کر دی۔ یہ محض اصلاح اقوام و ذہین کا کوئی خاص شعبہ نہ تھا جس کو تم نے پالٹکس، تمدن، اخلاق اور مذہب کے نام سے تقسیم کر دیا ہے بلکہ ان کی دعوت عالم اور ان کی اصلاح عالمگیر تھی۔ (ایضاً ص)

اُسی زمانہ کے الہلال میں ایک سلسلہ بعنوان الحریت فی الاسلام شروع کیا گیا تھا۔ اس کی تمہید میں تحریر ہے:۔
اسلام خود اپنے بیان کے مطابق ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ" و فی الاخرۃ حسنۃ۔ دین و دنیا کی اصلاح کے لئے آیا تھا اور اسی لئے دونوں جہان کی برکات اس کے ساتھ تھیں۔ پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام کے خزانہ میں حسنات سیاسیہ و دنیاوی کا وجود نہیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ نصف خدمت انسانی کی سرانجام دہی سے وہ مقصر رہا جس کا تخیل بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(الہلال ۔ بابت ۲؍جولائی ۱۹۱۳ء ۔ ص۹)

اُس زمانہ میں مولانا نے مسلمانوں کے مصائب کا حل ایک ایسی جماعت کے قیام میں تلاش فرمایا تھا جس کا نام تھا حزب اللہ۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں انہوں نے الہلال کی متعدد اشاعتوں میں مقالات تحریر فرمائے جن میں شروع سے آخر تک صرف ایک چیز کو پوری قوت کے ساتھ نمایاں کیا کہ اسلام ایک جماعتی مذہب ہے۔ اگر مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی مفقود ہے تو اسلام بھی مفقود ہے۔ یہ مقالات اس قابل ہیں کہ یہاں تمام و کمال نقل کئے جاتے لیکن اس سے یہ مضمون ایک کتابی شکل اختیار کرے گا۔ اس لئے ان کے جستہ جستہ اقتباسات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔
فرماتے ہیں:۔

پس میں کہتا ہوں اور از فرق تا بقدم ایک صدائے ربانی بن کر کہتا ہوں جب کہ یقین کی وہ لازوال طاقت میرے ساتھ ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں جب کہ وہ بصیرت الٰہی میرے دل کے اندر موجود ہے جس میں کبھی تزلزل و تذبذب نہیں اور جب کہ وہ شہادت ایقانی میرے سامنے ہے جس کی رویت میں کبھی دھوکا اور فریب نہیں کہ زندگیوں اور کامیابیوں کا وہ تخم مقدس کوئی انجمن، کوئی اسکیم، کوئی بے شمار خزانہ، کوئی عہد حفاظت، کوئی اقرار خدمت، غرضیکہ دنیا کی کوئی آواز اور انسانوں کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی مگر وہ صرف ایک ہی تحریک حق و صداقت ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کو ان کی حیات انفرادی و ملی کی ہر شاخ میں مسلمان

بننے کی دعوت دے۔ (الہلال ص)

ہم حضرت مولانا سے با ادب اتنا دریافت کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ آج وہ صدائے ربانی، وہ یقین کی لازوال طاقت، وہ بعبارتِ الٰہی، وہ شہادتِ ایمانی کیا ہوئی جو صرف اس تحریک کو حق و صداقت کی تحریک قرار دیتی تھی جو مسلمانوں کی حیاتِ انفرادی و ملی کی ہر شاخ میں انہیں "مسلمان" بننے کی دعوت دے۔ کیا وہ تحریک یہی تحریک کانگرس ہے جو مسلمانوں کا ایک الگ نام بھی سننا پسند نہیں کرتی۔ اور جس کے مسلمان علمبردار حضرات کہتے ہیں کہ مسلمان مت کہلاؤ، ہندی کہلاؤ جو مسلمانوں کی "حیاتِ ملی" کو تسلیم ہی نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ ملک میں دو ہی جماعتیں ہیں ملک، حکومت اور دوسری کانگرس۔ لیکن ٹھہریے۔ خود حضرت مولانا کی زبانی سنیئے کہ وہ تحریک جس کے اندر آج وہ خود شامل ہیں اور جس کی شمولیت مسلمانوں کے لئے "فریضۂ مذہبی" قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کی تحریک کے متعلق اسلام کی کیا شہادت دیتے فرماتے ہیں۔

> پھر جب آپ ایک انجمن قائم کرتے ہیں جس کے مقاصد و اعمال کی فہرست بیسیوں دفعات پر مشتمل ہے لیکن نہ تو اس میں کہیں احیاء دعوتِ اسلامی کی دفعہ ہے نہ کہیں اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہے۔ نہ کوئی صورت عمل و طریق کار ایسا پیشِ نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا اور ان کی مجاہدانہ روحِ عمل کو واپس لانا ہو۔ تو پھر فرمایئے آپ کا مقصد ضروری اور آپ کے کام یقیناً اچھے اور مستحقِ اعانت و شرکت جمیع مسلمین۔ لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے آپ نے کیا کیا اور اس کے لئے کہاں جائیں۔ (الہلال، بابت ۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء ص)

کیا حضرت مولانا فرمائیں گے کہ کانگرس کی دفعات میں وہ کون سی دفعہ ہے جس کی رو سے احیاء دعوتِ اسلامی ضروری اور اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہو۔ کانگرس کے دستورِ اساسی میں وہ کونسی صورتِ عمل اور طریق کار پیشِ نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہو! اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر فرمایئے کہ آپ کا مقصد تو ضروری (یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا) اور آپ کے کام یقیناً اچھے (یعنی ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا) اور مستحقِ اعانت و شرکت جمیع مسلمین (جسے پنڈت جواہر لال نہرو MUSLIM MASS CONTACT - سے تعبیر کرتے ہیں) لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے آپ نے کیا کیا اور اس کے لئے کہاں جائیں۔ کیا حق و صداقت کی تحریک یہی ہے جس کا نام کانگرس کا شعبۂ اسلامیات ہے اور جس کے انچارج ڈاکٹر اشرف اور ایک فعال رکن جناب منظر رضوی کے خیالات ابھی ابھی پیش کئے جا چکے ہیں۔ مولانا! خدا کے لئے سوچیئے کہ جس قسم کی تحریک کو ۱۹۱۳ء میں آپ اس حتم و یقین، اس بصیرت و ایقان کے ساتھ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا سامان قرار دیتے تھے، اسی تحریک کو آج عین مطابق کتاب و سنت اور صراطِ مستقیم قرار دے رہے ہیں۔ کیا آج قرآن بدل گیا یا مسلمانوں کے کعبہ کی سمت تبدیل ہو گئی! اس کا جواب بھی مولانا ہی سے سنیئے۔

> اسلام ایک آخری دینِ الٰہی تھا جس نے نہ صرف احکامِ شریعت میں ہی بلکہ حیاتِ قومی کی ہر شاخ میں ہم کو سب سے آخر اور سب سے بہتر اصول دے دیئے اور دنیا خواہ کتنی ہی بدل جائے لیکن آزما لیا جا سکتا ہے کہ ان اصولوں کی صداقت کو بدلنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔۔ تکمیلِ دین کے لئے ضروری تھا کہ ہمیشہ

کے لئے اس کے پیرو اپنی تمام اصولی ضروریات میں مستغنی اور بے پرواہ ہو جائیں اور ان کو کسی نئی تلاش اور نئے اصولوں کی جستجو باقی نہ رہے ...... میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملت وحصولِ عظمتِ ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی "نئے پن" کی ضرورت نہیں بلکہ صرف "تجدید" کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں پھر نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل وجواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل وجواہر کو نظرِ حسرت وطمع سے دیکھنے کی ضرورت نہیں، ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہیئے۔ جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال ہے (ایضاً صث)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جماعتی زندگی کی تنظیم اپنی مساجد سے شروع کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تقلیدی رنگ کی تحریک مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہو سکتی (ایضاً صفحہ) کیا ہم حضرت مولانا سے استدریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ کانگرس کی تحریک مسلمانوں کے لئے "تجدید" ہے یا "نیاپن"؟ کیا یہ تحریک مسلمانوں کی "حیاتِ ملت اور حصولِ عظمتِ ملی کے لئے ہی عمل میں لائی گئی ہے! کیا وہ لعل وجواہرات کی کانیں وہی تو نہیں جن کا آج اس تحریک کے علمبردار کھلے بندوں تمسخر اڑاتے ہیں! وہ آپ کے اٹل اور غیر متبدل اصول وہی تو نہیں جن کے مٹانے کی آرزو "تحریکِ آزادی کے قائدِ اعظم" (گاندھی) کے دل میں دن رات موجزن ہے (اس کا ثبوت آگے آئے گا)۔ کیا کانگرس میں شامل ہونے والے مسلمان "دوسروں کے لعل وجواہر کو نظرِ حسرت وطمع" سے نہیں دیکھ رہے! کیا اس تحریک سے آپ کو "اپنی گم کردہ کانوں کا سراغ" مل رہا ہے! کیا اس سے وہ تنظیم ملی عمل میں آ رہی ہے جس کی ابتدا مساجد سے ہونی تھی۔

اللہ اکبر! انسان بھی ایک طرفہ تماشہ ہے جب اس کے رجحانات قلبی وذہنی اس کی نگاہ کا زاویہ بدل دیں تو وہ کس قدر تضاد کا مجموعہ بن جاتا ہے اور کس طرح زہر کو آبِ حیات بنا کر پیش کرتا ہے۔ کتنی جلدی بھول جاتا ہے کہ جب اس کی آنکھوں پر کوئی رنگین چشمہ نہ تھا تو سامنے کی چیزوں کے اصلی رنگ کیا تھے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ پھر یہ بھی دیکھئے کہ جس چیز نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا تھا وہ کیا تھی، فرماتے ہیں:

ایک بہت بڑی چیز جس کی ہم میں کمی ہے تنظیماتِ عمل (آرگنائزیشن) ہے اور اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مقصد مشترک سامنے ہو اور سب میں اس کے نام سے ایک رشتہ باہمی قائم ہو جائے۔ (ایضاً ص۲۶)

آج اسی تنظیماتِ عمل (آرگنائزیشن) کا نام فرقہ پرستی (COMMUNALISM) ہے جو حضرت مولانا اور دیگر "قوم پرست" حضرات کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے جس کی معافی نہ یہاں مل سکتی ہے نہ خدا کے حضور۔ بھلا اس وقت مقصدِ مشترک "حیاتِ ملت اور عظمتِ ملی" تھا اور آج وہ مقصد تمام اہلِ ہند کی ایک متحدہ قومیت کی تشکیل ہے۔

(۱)

ہم نے کہا ہے کہ اسلام کی رُو سے مسلمانوں کے لئے صحیح نظامِ زندگی یہ ہے کہ ان کی اپنی جماعت ہو اور

اس جماعت کا مرکز ان کا اپنا امیر ہو۔ یہی جماعتی نظام مسلمانوں کے تمام " دینی اور دنیاوی " مسائل حیات کا فیصلہ کرے۔ اسلام کسی مخلوط جماعت کا قائل ہی نہیں۔ اس کے نزدیک ایمان اور کفر دو مستقل بالذات الگ الگ نظریۂ زندگی ہیں جن میں باہمی امتزاج ہو ہی نہیں سکتا۔ اب دیکھیے کہ حضرت مولانا کا اس اپنی جماعت کے متعلق کیا خیال تھا۔ ذرا غور سے سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور حیات جاہلی سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب از مولانا آزاد)

اس کے بعد حضرت مولانا نے متعدد احادیث سے ثابت کیا ہے کہ جو شخص اپنی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا سیدھا جہنم میں پہنچا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اس لئے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئتِ اجتماعیہ پیدا ہو۔ (ایضاً)

اس سے ذرا آگے ہے۔

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی "متحدہ قومیت" کی تصویر کھینچی گئی ہے ۔۔۔۔۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے، دیوار کا نام ہے۔ (ایضاً)

کیا حضرت مولانا اتنا ارشاد فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ مسلمانوں کی اس اجتماعی زندگی کا تصور آج کہاں چلا گیا؟ ان کی الگ جماعت کے اسلامی نظریہ کو آج کیا ہوا؟ یہ اسلامی متحدہ قومیت آج ہندی "متحدہ قومیت" سے کس طرح بدل گئی کہ جس کی اساس اسلام پر نہیں بلکہ وطن پر رکھی جا رہی ہے۔ یہ اجتماع کے بجائے افراد کی الگ الگ زندگی۔ جو کل تک قرآن و سنت کی رُو سے جاہلیت کی زندگی تھی، آج کس طرح عین اسلامی زندگی بن گئی!

یہ اسلامی اینٹیں کہ جنہیں باہمی اتحاد و ائتلاف کے سیمنٹ سے مل کر ایک ایسی مستحکم دیوار، ایک ایسی "بنیان مرصوص" بننا تھا جو کفر کی بڑھتی ہوئی رَو کا مقابلہ کر سکے۔ آج یہی اینٹیں ایک ایک کر کے اُس دیوار میں کیوں چنی جا رہی ہیں جس کی بنیاد ہی یکسر غیر اسلامی ہے۔ کیا حضرت مولانا مع اپنے تمام رفقائے کار کے کوئی ایک آیت، کوئی حدیث ایسی پیش کر سکتے ہیں جس میں یہ لکھا ہو کہ ملتِ اسلامیہ کی یہ اینٹیں کسی دوسری ملت کی اینٹوں کے ساتھ مل کر ایک مخلوط دیوار بھی قائم کر سکتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم حضرت مولانا یا اُن کے دوسرے ہم مسلک مسلم قوم پرست حضرات کو کسی طرح بھی مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ان استفسارات کا جواب دیں لیکن اگر انہیں ذرا سا بھی احساس ہو کہ قرآن و سنت کا بھی بالآخر کوئی حق ان پر واجب آتا ہے تو خدا کے لئے اپنی اس بے پناہ خاموشی کی مہر کو توڑیں۔ اور ایک مرتبہ اتنا تو بتا دیں کہ اس تبدیلیٔ مسلک کی تائید میں کون سی سند ان کے پاس ہے؟ اس مسلک کی تبدیلی کے جواز میں جس کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ

احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہد صحابہؓ

ست سے لے کر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔ قال صلی اللہ علیہ وسلم انی امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ و السمع والطاعۃ والھجرۃ۔ والجھاد فی سبیل اللہ انہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من جھنم۔ قالوا یا رسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صلی وصام و زعم انہ مسلم۔

یعنی فرمایا۔ تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع۔ طاعت۔ ہجرت۔ اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بھیڑیوں کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور!) کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ روزہ رکھتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا۔ ہاں اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔

اس کی تشریح میں فرماتے ہیں :۔

پہلی چیز جماعت ہے یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کر رہنا چاہیے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ آگے چل کر شہرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امر کے تابع نہ ہو، اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے۔ (ایضاً)

کیا حضرت مولانا کبھی رات کی تنہائیوں میں موجودہ مصلحت کوشیوں کو یکسر الگ رکھ کر اتنا سوچیں گے کہ آج جس روش پر وہ خود گامزن ہیں اور جس پر چلنے کی وہ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ وہ ان کے اپنے ہی الفاظ میں کس کی روش ہے؟ مسلمانوں کا اپنی جماعت کی تنظیم کرنا۔ ان کا اپنے مرکز قومی سے جڑ کر رہنا۔ یہ اسلامی زندگی ہے یا ان کا ایک ایک کر کے ایک ایسی مخلوط جماعت میں جا کر جذب ہوتے جانا جس کے عناصر ترکیبی میں کوئی عنصر بھی اسلامی نہیں، کیا یہی مسلمانوں کا "اپنا مرکز قومی" ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ آج ہماری کمزور، ناتواں، ملت اسلامیہ کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے وہ ان حضرات کی مہر سکوت کو توڑ سکے۔ لیکن بالآخر ایک دن ایسا بھی تو آنے والا ہے جب زبانیں خاموش ہوں گی لیکن جسم کا ایک ایک حصہ گواہی دے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا! یہ قرآن و سنت کی تصریحات ہم اپنی طرف سے پیش نہیں کر رہے یہ تو خود انہی حضرات کی پیش فرمودہ ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان سے قطعاً اس چیز کی باز پرس نہ ہوگی کہ ان تمام تصریحات کو خود ہی بیان کرنے کے بعد تم لوگ کس راستے پر چل پڑے۔

اور دوسرے لوگ اس خیال سے کہ تم قرآن و سنت کے جاننے والے ہو، تمہارے متبع میں تمہارے پیچھے ہو لئے۔ کیا ان سب کی ذمہ داری بھی انہی پر عاید نہ ہوگی۔ ذرا قرآن کریم کو کھول کر دیکھئے کہ اس باب میں احکم الحاکمین کا کیا فیصلہ ہے۔ انہی حضرات کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

> پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا۔ اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا۔ گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔ ایضاً

ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ یہ ان حضرات کی شان میں سوء ادبی سمجھی جائے گی۔ جب خدا اور اسکا رسولؐ یہ کچھ فیصلہ کر رہا ہو تو ہمیں کسی اضافہ کی کیا ضرورت ہے۔ انہی سے ملاحظہ فرمایئے کہ مسلمانوں کے لئے راہِ عمل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> مسلمانوں کے لئے راہِ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہیں۔ اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔ جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک "جماعت" بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اس گلہ کی طرح ہیں جن کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ (ایضاً)

ایسی غیر اسلامی زندگی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

> قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔" (ایضاً)

ہمیں بالعموم بتایا جاتا ہے کہ صاحب! مسلمانانِ ہند کے سامنے دو چیزیں ہیں۔ ایک تو جماعتی تنظیم اور دوسرا ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دینا۔ چونکہ انگریزوں کی غلامی بہت بڑی لعنت ہے اس لئے مقدم یہ مسئلہ ہے۔ جب یہ حل ہو جائے گا تو پھر مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا سوال ہاتھ میں لے لیا جائے گا۔ آج یہ دلیل دی جاتی ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ دلیل بڑی محکم ہے۔ لیکن جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔ خود حضرت مولانا کو اقرار ہے کہ جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔" اب فرمایئے کہ مقدم جماعتی زندگی کی تنظیم ہوئی یا انگریزوں کا ہندوستان سے نکالنا۔ ہم مان لیتے ہیں کہ کانگریس کے ساتھ مل کر آپ انگریزوں سے آزاد ہو جائیں گے۔ لیکن جب آپ آزاد ہوں گے تو اس وقت ملتِ اسلامیہ کہاں ہوگی؟ کیا تخم ہلاکت جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے۔" پوری کی پوری قوم تباہ نہ کر چکا ہوگا۔ اس وقت کی آزادی سے آپ کو خوشی کیا ہوگی! پچھلے دنوں لندن کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے ایک معرکۃ الآراء آپریشن کیا۔ آپریشن بڑا نازک تھا۔ تمام دنیا کے اہل فن حضرات کی آنکھیں نتیجہ کی طرف لگ رہی

تھیں۔ وہ اپریشن سے فارغ ہوا تو ساری دنیا میں مسرت کے تار دیئے کہ اپریشن بڑا کامیاب رہا، بہایت صفائی سے نازک ترین مراحل طے ہو گئے۔ البتہ صرف اتنا ہوا کہ مریض چل بسا۔ یہ حضرات اسی قسم کے اپریشن میں مصروف ہیں اور پھر متمنی ہیں کہ قوم ان کی خدمات جلیلہ کی شکر گزار ہو۔ کیا ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ انگریزوں کی غلامی میں مسلمان اسی لئے آ گئے تھے کہ ان میں جماعتی زندگی کا فقدان ہو چکا تھا۔ اور اب مسلمان غلامی سے نکل بھی اس وقت سکیں گے جب ان میں جماعتی نظام پیدا ہو گا۔ ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی زندگی مرادف الفاظ نہیں۔ اسلئے کہ جس تشتت و افتراق میں جماعتی زندگی کی معصیت کے دور سے مسلمان آج گزر رہے ہیں، اس کا تو لازمی نتیجہ بقول حضرت مولانا، پوری کی پوری قوم کی تباہی ہے۔ جب قوم ہی نہ ہو گی تو آزاد کون ہو گا؟ مسلمانوں کی آزادی کا مفہوم وہ ہے جسے خود حضرت مولانا نے اپنے مسلک قومیت پرستی سے پیشتر ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔

اسلام میں حق امر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ ان الحکم الا للہ۔ تو اس کے احکام دینیہ کیونکر تابع آرا۔ اشخاص و جماعت مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس نے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے یا پھر دنیوی امور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریت رائے سے عبارت ہے۔ (الہلال - ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

اسی کا نام ہے اسلامی نظام اجتماعی۔ لیکن مولانا حسین احمد صاحب مدنی فرماتے ہیں۔

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی سب شامل ہیں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔ (زمزم ۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء)

اور خود مولانا آزاد آج عملاً اسی قسم کی آزادی کے حصول اور اسی قسم کی جمہوری حکومت کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہیں اور اسے جہاد عظیم قرار دے رہے ہیں۔ اس قسم کی جمہوری حکومت کی سند ملاحظہ ہو۔

آپ روزانہ مسجدیں غیر مسلم انجینیر سے بنواتے ہیں۔ غیر مسلم ڈاکٹروں سے علاج کراتے ہیں۔ سینکڑوں کام روزمرہ غیر مسلموں سے کراتے ہیں۔ کیا یہ سب ناجائز ہیں؟ (تقریر مولانا حسین احمد صاحب۔ زمزم ۷ جولائی ۳۸ء)

یعنی جب تم ہندو انجینیر سے اپنی مرضی کے ماتحت اپنی متعین کردہ سمت اور وضع کے مطابق مسجد کا نقشہ تیار کرا لیتے ہو، یا ہندو حجام سے خط بنوا لیتے ہو تو ایسے نظام حکومت کے قیام میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے جس میں ہندو بھی شامل ہوں۔ بلکہ اکثریت انہی کی ہو! کیا عجیب قرآنی استدلال ہے اور کیسی نادر تفسیر ہے اس آیت مقدسہ کی کہ وامرہم شوریٰ بینہم یعنی مسلمانوں کی حکومت ان کے اپنے باہمی مشوروں سے ہو گی۔

یہاں پہنچ کر آپ کے دل میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہو گا کہ جب مولانا آزاد کے نزدیک چند سال اُدھر اسلام نام ہی اس چیز کا تھا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت ہو۔ ان کی اپنی متحدہ قومیت ہو۔ ان کا اپنا مرکز ہو۔ ان کے تمام معاملات اس نظام کی رو سے طے پائیں جو خالص قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی اپنی اکثریت کی رو سے وجود میں آئیں۔ ان کے لئے کوئی ایسی تحریک جو ان کی احیائے ملی کے لئے عمل میں نہ آئی ہو کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی خواہ اس کے مقاصد کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں۔ کوئی ایسی تحریک جو ان کو انفرادی اور ملی حیات

کے ہر شعبہ میں مسلمان بننے کی دعوت نہ دیتی ہو کبھی حق و صداقت کی تحریک نہیں ہو سکتی۔ جب حضرت مولانا کا ایمان اور ایمان یہ تھا تو پھر آج یہ کیا ہوا کہ ان کے نزدیک یہ تمام اصول مردود قرار پا گئے اور ان کی جگہ ایک ایسے مسلک نے لے لی جس کی رو سے ان اصولوں کا نام تک لینا بھی جرم قرار پا گیا تھا۔ اس کا جواب شاید آپ کو نہ مل سکے لیکن آیئے ہم آپ کو تھوڑا سا سراغ دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہیں۔ سو قرآن کریم کی وہ آیات جن کی رو سے وہ پہلے اصول اسلامی ثابت کیا کرتے تھے، بعد میں منسوخ ہو گئے۔ لیکن یہاں پھر یہ مشکل آپڑے گی کہ آپ کو منسوخ آیات کا تو پتہ مل جائے گا، مگر یہ پتہ نہیں مل سکے گا کہ ناسخ آیات کون سی ہیں۔ اس لئے کہ جب سے حضرت مولانا نے یہ نیا مسلک اختیار فرمایا ہے، اس مسلک کی تائید میں آج تک کوئی آیت و حدیث پیش نہیں کی۔ لہذا یہ "ناسخ آیات" آپ کو قرآن کریم میں نہیں ملیں گی۔ ان ناسخ احکام کا ماخذ کچھ اور ہے۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ اصولی چیز تو یہی ہے نا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت اور اپنی متحدہ قومیت ہونی چاہیئے اس کے متعلق ارشاد ہے۔

> ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔ ..... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک ایسی چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشو و نما ہی نہیں پا سکے گی۔ (میری کہانی۔ از پنڈت جواہر لال نہرو۔ جلد دوم ص ۳۳)

کیا آپ کے خیال میں کہ مسلم قومیت کا نظریہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کے نزدیک "لغو" کیوں قرار پا گیا ہے؟ اور آگے بڑھیئے۔ ارشاد ہے۔

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔
>
> (خطبہ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء۔ از پنڈت جواہر لال نہرو)

کس قدر حسرت اور کتنا استعجاب ٹپکتا ہے اس فقرے سے کہ "ابھی تک ایسے لوگ زندہ ہیں"۔ گویا ان کے نزدیک زندہ رہنے کا حق صرف انہی کو ہونا چاہیئے جو اس دقیانوسی خیال سے توبہ کر کے ان کی ہمنوائی میں فتویٰ صادر کر دیں کہ مسلمان کوئی الگ قوم و ملت نہیں ہے۔ آج قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ اوطان پر رکھی جاتی ہے۔

"مسلم قومیت" کا تصور جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک منظم مذہب (ORGANIZED RELIGION) ہے اور یہی خصوصیت ہے جو اسلام کو دیگر ادیان سے متمیز کرتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے قوم پرست حضرات مذہب کو پرائیویٹ عقیدہ کا نام دیتے ہیں اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔ اب دیکھیئے کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے یہ نظریہ کہاں سے لیا ہے۔ پنڈت جی ارشاد فرماتے ہیں:

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق لینے والوں کی بقا کا حامی ہے (میری کہانی)

غور فرمایا آپ نے کہ "منظم مذہب" کو مٹانے کی آرزو کہاں سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ "منظم مذہب" دنیا میں صرف اسلام ہی ہے اس لئے بالفاظ دیگر "اسلام کو مٹانے" کی وہ آرزو کہاں سے پیدا ہو رہی ہے جس کی تائید ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کر رہے ہیں۔ اور آگے بڑھئے۔ ارشاد ہے۔

منظم مذہب بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ (ص ۱۶۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ وہی مقصد اسلامی جسے حضرت مولانا "احیائے ملّی" سے تعبیر فرماتے تھے، اب ایک ایسے گھناؤنے جذبہ کا نام ہو گیا جسے "مستقل اغراض" سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اس نظریہ کو "ترقی دشمن" کہا جاتا ہے۔ گویا "ترقی" یہ ہے کہ "منظم مذہب" یا اسلامی جماعتی نظام کا وجود دنیا میں نہ رہے۔

(۳) مسلم قومیت، جس کے متعلق حضرت مولانا پورے ایقان و بصیرت سے فرماتے تھے کہ عین اسلام ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔ (ایضاً ص ۳۳۲)

امید ہے کہ حضرت مولانا نے سابق صدر کانگریس سے ضرور معذرت حاصل کر لی ہوگی۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس مسلم قومیت کے تخیل کی اشاعت کے زیادہ تر ذمہ دار خود وہی تھے۔

مضمون بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس لئے ہم سردست انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ انہی سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے جو اپنا رُخ کعبے سے پھیر کر ترکستان کی طرف کر لیا ہے وہ کس قبلہ نما کی سوئی کے رُخ کو دیکھ کر کیا ہے۔ تاسف صرف اس چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے کہ امیال و عواطف انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ وہی مولانا آزاد جو لاہور کی انجمن کے ایک ریزولیوشن کو دیکھ کر سر تا پا آگ ہو جاتے تھے اب کچھ ایسے بیٹھے ہیں کہ تمام چیزیں اپنی آنکھوں سے پڑھ رہے ہیں، اسلامی محکمات کا یوں تمسخر اڑتا دیکھ رہے ہیں اور ایک لفظ احتجاج کا نہ ان کی زبان سے نکل سکتا ہے نہ قلم سے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ وہ تمام مسلمانانِ ہند کو عملاً بتا رہے ہیں کہ وہ رستہ جو اس کانگریس کا تجویز فرمودہ ہے اور جس کے "قائد اعظم" کے خیالات آپ نے ملاحظہ فرما لئے ہیں۔ وہی راستہ دین کا صراطِ مستقیم ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے، باطل کا راستہ ہے۔ اس

ے ہندو مہاسبھا ویسے ہی ہندوؤں کی الگ جماعت ہے جیسے مسلم لیگ مسلمانوں کی ۔ ۔ ۔ کانگریس ہندوستان میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی جماعت ہے۔" (تقریر مولانا حسین احمد مدنی۔ زمزم ۔ ۷ر جولائی ۴۳ء)

کے جواب میں سوائے اس کے کہ ہمارے دُکھے ہوئے دل کی آہیں' سرمد مرحوم کی ایک رباعی کی شکل میں حضرت مولانا اور ان کے دیگر ہم مسلک علمائے کرام کی خدمت میں شرفِ پذیرائی حاصل کر لیں' ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

سرمد در دیں عجب شکستے کر دی، ایماں بفدائے چشمِ مستے کر دی
با عجز و نیاز جملہ نقدِ خود را، رفتی و نثارِ بت پرستے کر دی

تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہونی چاہیئے' اس کے متعلق دورِ قومیت پرستی سے پیشتر مولانا آزاد صاحب کو مذہب کیا سکھاتا تھا، ملاحظہ فرمایئے۔

ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ تقسیم بنگالہ کی تنسیخ سے نہیں بلکہ پیشتر سے اپنے اندر آزادی اور حقوق طلبانہ پالیسی کا ولولہ رکھتے ہیں' گو عام راہِ ضلالت سے الگ رہنے کا انہیں الاؤنس دینا چاہیئے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کے سامنے بھی ہندوؤں کی پولیٹیکل جدوجہد کے سوا کوئی مستقل اور علیحدہ راہ نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی ترقی کا سدرۃ المنتہیٰ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سیکھ جائیں۔ بیشک ہمارے عقیدہ میں بھی آجکل مسلمانوں کے لئے عبرت اور تنبیہ کا سب سے بڑا سبق ہندوؤں کے سیاسی اعمال میں ہے اور بڑی بدبختی یہی تھی کہ آج تک اس سے عبرت حاصل نہیں کی گئی۔ لیکن پیروانِ "امامِ مبین" کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت نہیں ہو سکتی کہ اعمالِ زندگی کے ایک ضروری شعبے میں اُن کو اسلام تعلیم دینے سے مجبور و لاچار ہو گیا ہو اور اس کی طرف سے مایوس ہو کر انہیں ایک دوسری قوم کے دسترخوان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر للچانا پڑے۔ اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے سے یا بسترِ نزع پر سورۂ یٰسین کو دہرا دینے کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما دھبہ نہیں ہو سکتا ہے کہ انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں ..... پس اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر' ہندو یا مسیحی بن کر نہیں۔ اگر شمع کافوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اس کا ٹمٹماتا ہوا دِیا چرانے کی کیا ضرورت ہے پھر یہ بھی فرض کر لیجیئے۔ کل ہندوؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی جتنی راہیں انسانی دماغ کی پیدا کردہ ہیں اُن میں تغیر و تبدل ہر وقت ممکن ہے البتہ خدا کی تعلیم میں ممکن نہیں کہ لا تبدیل لکلمات اللہ۔ پھر کیا اس حالت میں مسلمان بھی اپنے اماموں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دیں گے؟ ذرا غور سے کام لیجیئے کہ گہری اور متفکر طلب باتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ خواہ کسی اصول پر مبنی ہو لیکن وہ ایک ایسی راہ پیدا کر لیں جو ان کی مستقل اور مخصوص راہ ہو جس میں کبھی تغیر کی ضرورت نہ ہو۔ تمام خارجی اثرات تغیر سے محفوظ ہوں۔ نیز کہا جاسکے کہ وہ مسلمانوں کی راہ ہے ..... ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر حیثیت مذہب یا بالفاظِ مناسب قرآن کا کاروبار صرف خدا سے ہے بس جب تک وہ اپنے

تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے، اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر رکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف "اسلام" یا خدا کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "منیفن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلہ میں اگر کوئی لفظ ہے تو خدا یا اسلام ہے..... (الہلال)

(۱) مسلمانوں کے لئے ہر شئے ان کے مذہب میں ہے۔ پس اگر وہ آجکل اپنی پولیٹیکل زندگی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ اس شئی ہی کو کیوں نہ پیدا کریں جو نہ صرف پالیٹکس بلکہ قومی اعمال کی ہر شاخ کو زندہ کر دے۔

(۲) قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے کے لئے ہی نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لئے ایک کامل اور اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں۔ پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا ان کے لئے موجب فوز و فلاح نہیں ہو سکتا۔

(۳) ان کو اپنا نصب العین صرف "اسلام" بنانا چاہیئے اور ساری طاقت اس میں صرف کرنی چاہیئے کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف احکام اسلام کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ اسلام ہی ان کے لئے پالٹکس کی راہ کھولے گا، تعلیم کا حکم دے گا۔ اخلاق و خصائل میں تبدیلی پیدا کر دیگا اور وہ تمام باتیں جن کو ترقی یافتہ قوموں میں دیکھ کر وہ للچا رہے ہیں۔ نقصانوں اور مضرتوں سے صاف ہو کر ان میں پیدا ہو جائیں گی۔

(۴) تعلیم، معاشرت اور سیاست میں ان کو بر بنائے اتباع اقوام کوئی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیئے بلکہ بر بنائے مذہب۔

(الہلال ۔ ۹ر اکتوبر ۔ ۲۳ر اکتوبر و ۶ر نومبر ۱۹۱۲ء)

کیا کوئی خدا کا بندہ ایسا ہے جو قوم کو اتنا پوچھ کر بتا دے کہ قرآن کریم کی وہ تعلیم جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہ تھا، وہ آج کس کی نذر ہو گئی! یہ نیا مسلک جو بر بنائے اتباع اقوام اختیار کیا جا رہا ہے اور جس کی طرف مسلمانوں کو پکار پکار کر بلایا جا رہا ہے، کون سے نئے قرآن سے حاصل کیا گیا ہے؟ مسلمانوں کی اس مذہبی موت کا ذمہ دار کون ہے جس کی رُو سے انہیں ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سکھایا جا رہا ہے۔ وہ کون سا سامری ہے جس کی فسوں سازی ملت بیضا کو خدائے طور سینا سے گئو سالہ پرستی کی طرف لئے جا رہی ہے۔ وہ کونسا مقناطیس ہے جس نے مسلمانوں کے قبلہ نما کی سوئی کا رُخ "آنند بھون" کی طرف پھیر دیا ہے۔ وہ کون ہے جو آج دوسروں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کے پیچھے للچایا ہوا دوڑ رہا ہے۔ وہ کون سا فقیر ہے جس کی جھونپڑی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آج شمع کافوری سے بھی زیادہ درخشندہ و تابناک بنا کر دکھایا جا رہا ہے۔ وہ کون ہے جو مسلمانوں کے اندر اسلام یا خدا کے نام سے نہیں بلکہ قوم اور وطن کے نام سے زندگی کی حرارت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ کون سی مستقل اور علیحدہ راہ ہے جو ہندوؤں سے ہٹ کر مسلمانوں کے لئے تجویز کی جا رہی ہے۔ وہ کون سا گروہ ہے جو آج مذہب کو خطبۂ نکاح اور وضو اور غسل کے مسائل تک محدود کر دینا چاہتا ہے!! ہاں۔ ذرا غور سے کام لیجئے کہ یہ گہری اور تفکر طلب باتیں ہیں!

کسی صاحب نے حضرت مولانا آزاد کو لکھا کہ وہ مذہب اور پالیٹکس کو آپس میں کیوں ملا دیتے ہیں۔ نیز یہ دریافت کیا کہ مسلمانوں کو سیاست ہند میں کون سی راہ عمل اختیار کرنی چاہیئے۔ اس کے جواب میں وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

لیکن کب؟ دور قوم پرستی سے پیشتر۔

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیئے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ وہ مذہبی رنگ ہی نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو، ایک کفر صریح ہے۔ اور پالٹیکس بھی اسی میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصل عظمت میں نہیں دیکھا۔ "ما قدروا اللہ حق قدرہ" ورنہ اپنی پولیٹیکل پالیسی کے لئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کی اقتداء کرنے کی ضرورت پیش آتی ۔۔۔۔۔۔

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں پولیٹیکل خیالات کے تین راستے موجود ہیں، الہلال کس راہ پر قوم کو لیجانا چاہتا ہے ..... الحمد للہ کہ ہم جناب کی قرار دی ہوئی تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے بلکہ اس چوتھی راہِ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں جو قرآن کی بتلائی ہوئی راہ صراطِ مستقیم ہے۔ اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ مشرک فی صفات اللہ کی طرح مشرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے آگے کھڑی ہو جائے گی۔ ان کا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں۔ خدا ان کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اسکو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اسکی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔

یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں۔ یہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع و تقلید ہے۔ اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی پولیٹیکل راہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اس کو یہی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ (مضامین آزاد۔ حصہ دوم)

اسی سلسلہ میں حضرت مولانا دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

ہم تو خود اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انہوں نے اپنے سامنے دو راستے ہی دیکھے۔ یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگرس کی شرکت۔ یعنی ہمیشہ آزادی سیاسی (؟) کو ہندوؤں کا مرادف سمجھا مگر خود اپنے تئیں بھولے رہے اور اس لئے بھولے رہے کہ خدا کو بھلا دیا ..... اسلئے ہماری تمام سعی و جہد کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو یاد دلا دیں کہ دنیا میں رہنے کے لئے جتنی چیزیں مطلوب ہیں وہ خود ان کے پاس موجود ہیں۔ اوروں کے دروازوں کو دریوزہ گری کے لئے کیوں تک رہے ہیں۔ (الہلال ۱۰ دسمبر ۱۹۱۳ء)

یہ اقتباسات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ ارباب نظر خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ قرآن کریم مسلمانوں کو کس طرف لیجانا چاہتا ہے اور یہ حضرات اب کس طرف کی دعوت دے رہے ہیں۔ سوتے کو تو جگا دینا آسان ہوتا ہے لیکن جاگنے والے کو کون جگائے؟ کہہ دیا جا سکتا ہے کہ حالات کے بدلنے سے مسلک میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ لیکن جو مسلک نہ کسی انسان کے دماغ کی اختراع ہو نہ کسی جماعت کی تقلید و اتباع بلکہ وہ خدائے حی و قیوم کے غیر متبدل قوانین کا مجموعہ ہو، کیا وہ حالات کے بدلنے سے ایسا بدل جایا کرتا ہے کہ ایک چیز جو ایک وقت میں عین کفر و شرک "ہو دوسرے وقت میں یکسر ایمان و اسلام" بن جائے؟ پھر لطف بھی تو یہ ہے کہ آج تک ان حضرات میں سے کسی نے اتنا بھی تو نہیں بتایا کہ وہ کون سے حالات تھے جو اب بدل چکے ہیں اور وہ کون سے احکامات قرآنی ہیں جن کے ماتحت اب یہ نیا مسلک جو اس وقت "کفر و شرک" کا مسلک تھا، توحید و ایمان "کا مسلک بن گیا ہے۔ ہم تو اتنا قدر سمجھ سکے ہیں کہ:۔

شیخ ملت با حدیث دلنشیں ؛ بر مراد او کند تجدید دیں!

ایک عالم کی لغزش کا یہی خطرناک انجام ہے جس کے متعلق حضور صادق صلعم نے فرمایا کہ:۔

میں اپنی امت کے حق میں سب سے زیادہ جن چیزوں سے ڈرتا ہوں وہ تین ہیں۔

(۱) عالم کی لغزش۔ (۲) منافق کا قرآن سے استدلال۔ اور (۳) وہ دنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگے۔

شعبی کی روایت میں تیسری چیز ہے "گمراہ کرنے والے سردار (لیڈر)"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

عالم کی لغزش سے بچو اور غلطی سے اس کے رجوع کا انتظار کرو۔

ہندوستان کے مسلمان اب اس حدیث مقدسہ کے مطابق انتظار میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو کب توفیق عطا فرماتا ہے کہ یہ اپنی غلطی سے رجوع کریں، کہ جس قدر تباہی کا موجب یہ حضرات اب تک ہو چکے ہیں، قوم کے لئے وہ بھی کچھ کم نہیں۔

(۰)

[یہ تھا وہ مقالہ جو جون ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ اس قسم کے مقالات اس زمانے میں اس میں شائع ہوا کرتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس دور میں کشمکش کیا تھی؟ "قومیت پرست" مسلمانوں کا مسلک کیا تھا اور اقبال" اور قائداعظم کی دعوت کیا جس کا نقیب طلوع اسلام تھا۔ تحریک پاکستان کا جذبہ محرکہ کیا تھا اور مطالبہ پاکستان کا تقاضا کیا!

اور اس سے اس بات کا بھی اندازہ لگائیے کہ پاکستان کی آزاد، خود مختار، الگ مملکت کے استحکام اور بقا کا اس خطہ میں اسلام کے مستقبل سے کس قدر گہرا تعلق ہے، اور ہندو اور ہندو نواز عناصر کے اس وقت عزائم کیا تھے اور اس وقت سازش کیا ہے۔ طلوع اسلام]